طلوعِ اسلام

جولائی ۱۹۵۱

-/8/-

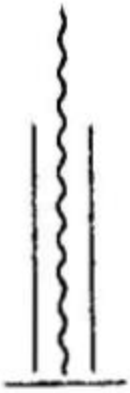

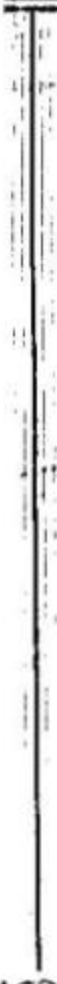

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہِ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے، نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیز اگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتب	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		" غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۴ — جولائی ۱۹۵۱ء — نمبر ۷

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
لمعات	۴ - ۹
ماہِ نَو (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۱۰
قربانی	۱۱ - ۴۴
لیلۃ القدر — عید — اور عید کا پیغام (علامہ اسلم جیراجپوری صاحب و پرویز صاحب)	۴۵ - ۵۳
نقد و نظر	۵۴ - ۶۵
باب المراسلات	۶۶ - [illegible]
۱- عید	
۲- صدقۃ الفطر	
۳- انتظامِ یوسفی	
عیش دوام است اینجا (نظم) (محمد ایوب صاحب)	۶۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

رمضان المبارک کا مہینہ اپنی تمام عظمتوں اور برکتوں کو ساتھ لیکر آیا اور چلا گیا۔ اس گئے گذرے زمانے میں بھی، جبکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے، جس پابندی، اہتمام اور عقیدت سے مسلمان اس کٹھن منزل کو خندہ پیشانی سے طے کرتے ہیں، دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ جون کے مہینے کی چلچلاتی دھوپ۔ اس دھوپ میں دن بھر کی محنتِ شاقہ۔ غریب لوگ، اس جھلس دینے والی لُو اور تڑپا دینے والی تمازت آفتاب میں، روٹی کمانے کے دھندے میں مصروف۔ اس کے ساتھ پندرہ سولہ گھنٹے دن کا روزہ۔ اور اس روزہ میں غذا کیا؟ بالعموم سوکھی روٹی۔ کیونکہ روزہ عام طور پر غریب طبقہ رکھتا ہے اور غریبوں کو سوکھی روٹی بھی مل جائے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ قریب قریب رات بھر جاگنا اور دن بھر منہ بند کئے حصول معاش میں لہو پانی ایک کر دینا۔ اور یہ انداز ایک آدھ دن کے لئے نہیں۔ ایک آدھ ہفتے کے لئے نہیں۔ کامل مہینہ بھر کے لئے۔ دنیا کی قومیں جب اس تفصیل کو سنتی ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتی ہیں۔ اور بات ہے بھی تعجب انگیز اور حیرت ناک!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مشقت کیوں اٹھائی جاتی ہے؟ ایسی جانکاہ محنت سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ اس کا بالآخر مقصود کیا ہے؟ روزوں کی غایت کیا ہے؟

عوام کی طرف سے اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ مل جاتا ہے کہ روزے اسلئے رکھے جاتے ہیں کہ خدا کا حکم ہے۔ ان کی طرف سے یہ جواب بالکل درست ہے اور ان کے اطمینان کے لئے کافی۔ ذرا اور کرید کر پوچھئے تو اس پر اتنا اضافہ اور ہو جائیگا کہ روزوں سے ثواب ملتا ہے اور یہ عاقبت میں نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔

لیکن قرآن تو تدبر اور تفکر کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا جواب، از روئے تدبر و تفکر بھی موجب اطمینان اور وجہ طمانیت بن سکتا ہے؟ اس کے متعلق آپ ہم سے نہیں بلکہ اپنے دل سے پوچھئے۔ اگر آپ کا دل مندرجہ صدر جواب سے مطمئن ہو جاتا ہے تو پھر جو کچھ آئندہ سطور میں لکھا جارہا ہے آپ اسے بالکل نہ پڑھئے۔ وہ آپ کیلئے نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کا دل اس سے مطمئن نہیں ہوتا، اگر اس میں کچھ کھٹک رہتی ہے تو اس کھٹک سے

گھبرائیے نہیں۔ بلکہ اس سوال پر غور کیجئے۔ کیونکہ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنی تعلیم کو اندھا دُھند نہیں منوانا چاہتا۔

غور و فکر کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو احکام دین کے مصالح گنوانے میں عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ روزے کا اثر صحت پر بڑا عمدہ پڑتا ہے۔ اس سے معدے کی تکان اتر جاتی ہے۔ جسم کے فاسد اخلاط کا تنقیح ہو جاتا ہے۔ بلغمی مواد جل جاتا ہے اور انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طبی نقطۂ خیال سے روزوں سے یہ فوائد بھی حاصل ہو جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے محض معدوں کی اصلاح کیلئے اس تاکید و اصرار کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا پروگرام بطور فرض عائد کر دیا؟ اگر ایسا ہی تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے صاف صاف کیوں نہ کہدیا؟ اس غرض و غایت کو (معاذ اللہ) چھپا کر رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟ یہ تو کچھ بات نہ ہوئی!

غور و فکر کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے روزوں کا حکم دیا ہے، دیکھیں کہ کیا اس نے ان کی کوئی غرض و غایت بتائی ہے اور اگر بتائی ہے تو وہ کیا ہے؟ قرآن کا اپنے احکام کے بارے میں ایک خاص انداز ہے۔ وہ ایک حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل سے کیا کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ وہی نتائج اس حکم کی علت اور مقصود ہوتے ہیں۔ حکم کو کتاب (قانون) کہا جاتا ہے اور ان کی علت اور غایت کو حکمت۔ دونوں (کتاب و حکمت) منزل من اللہ ہیں اور قرآن کے اندر۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور دین میں ایک یہ بھی فرق ہے۔ مذہب اپنے حکم کو اندھا دُھند منوانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے احکام کا کوئی نتیجہ انسان کے سامنے نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے احکام کا کوئی نتیجہ ہوتا ہی نہیں۔ وہ محض رسومات کا مجموعہ ہوتے ہیں اور لوگوں سے ان کی اتباع کرانے کے لئے وہ ان کے دل میں یہ عقیدہ جاگزیں کر دیتا ہے کہ تمہارا کام تو احکام کی تعمیل ہے نہ کہ نتائج کا مطالبہ۔ ان کی تعمیل سے "ثواب" ہوتا ہے اور ثواب کوئی ایسی چیز نہیں جو محسوس و مشہود طریقے پر تمہارے سامنے آسکے۔ یہ تمہارے "حساب" میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ قیامت کے دن میزان میں تُل کر تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس، دین اپنے احکام (اجزائے نظام) کی غایت اور مقصود بھی ساتھ کے ساتھ بتا دیتا ہے۔ اس سے دو فائدے متصور ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس حکم کی مصلحت کیا ہے۔ اس سے "دل" کے ساتھ انسان کا "دماغ" بھی مطمئن ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل بھی ہو رہی ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ اس کے بعد نسخہ تجویز کرتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اس کے استعمال سے کیا کیا نتائج ظہور میں آئیں گے۔ اگر وہ طبیب حاذق ہے اور آپ نے دوائیاں بھی اصلی

حاصل کرلی ہیں اور نسخہ اس کی ہدایت کے مطابق استعمال کیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوگا جو طبیب نے بتایا تھا۔ اگر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تو آپ کو لامحالہ سوچنا ہوگا کہ کہاں نقص رہ گیا ہے؟ کونسی کمی واقعہ ہوگئی ہے؟ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ نسخہ تجویز کرنے کے ساتھ ہی واضح الفاظ میں بتا دیتا ہے کہ اس کے استعمال سے کیا کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ اگر نتائج ویسے مرتب ہوتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ نسخہ کا استعمال صحیح ہو رہا ہے۔ لیکن اگر نتائج میں فرق ہے تو ہمیں یقیناً سوچنا پڑیگا کہ نسخہ کا استعمال صحیح طور پر نہیں ہو رہا۔ لیکن اگر ویسے نتائج بھی مرتب نہیں ہوتے اور ہم اس کے باوجود نسخہ کو اسی طرح برابر استعمال کئے جاتے ہیں تو اس سے ہماری ساری محنت رائگاں جائیگی (اولٰئک حبطت اعمالہم) اور نہ صرف یہ کہ محنت رائیگاں جائیگی بلکہ نمعلوم مرض بڑھ کر کیا سے کیا بن جائے گا۔ وذالک خسران المبین۔

قرآن نے روزے کے متعلق واضح طور پر بتا دیا کہ

(۱) یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ تاکہ تمہیں تقوٰی کی کیفیت حاصل ہو جائے۔

(۲) لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم۔ تاکہ تم اس نظام زندگی کے ذریعے جس کی طرف تمہاری راہ نمائی کی گئی ہے، اس قابل ہو جاؤ کہ دنیا میں قانونِ خداوندی کو سب سے اونچا رکھ سکو۔

(۳) ولعلکم تشکرون۔ تاکہ تمہاری مساعی مشکور ہو جائیں۔

یعنی روزے فرض کئے گئے ہیں تاکہ (۱) تم میں تقوٰی کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ (۲) تم قانونِ خداوندی کو دنیا میں سب سے بلند کر سکو اور (۳) تمہاری مساعی مشکور ہوں۔ اگر تمہارے روزوں سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں تو سمجھ لو کہ روزے منشائے خداوندی کے مطابق رکھے جا رہے ہیں۔ اگر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو سمجھ لو کہ عمل میں کہیں نقص رہ گیا ہے۔ اس لئے اس نقص کا رفع کرنا نہایت ضروری ہے۔

تقوٰی، قرآن کی ایک خاص اور بڑی اہم اصطلاح ہے۔ اس کا تفصیلی مفہوم کیا ہے، اس کے بیان کرنے کے لئے بڑی گنجائش اور فرصت کی ضرورت ہے جو لمعات میں ضمناً اور تبعاً ممکن نہیں لیکن مقصد زیر نظر کے لئے صرف اس قدر دیکھ لینا کافی ہوگا کہ جس جماعت میں تقوٰی پیدا ہو جاتا ہے قرآن اس جماعت کو کن خصوصیات کا حامل قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(۱) الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ (۱۰/۶۲)

آگاہ رہو! جو قانون خداوندی کی اتباع کرنے والے ہیں ان کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ غمگینی۔ یہ ہیں وہ لوگ جنھیں ایمان والے اور تقوٰی والے کہا جاتا ہے۔

یعنی تقویٰ کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس قوم کو نہ خارجی خطرات کا خوف ہو نہ اندرونی تصادمات کا اندیشہ۔

(ii) یا ایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا۔

اے ایمان والو۔ اگر تم نے تقویٰ اختیار کر لیا تو اللہ تمہیں امتیازی زندگی عطا کر دیگا۔

یعنی تقویٰ کا نتیجہ ایک امتیازی زندگی ہوتا ہے۔

(iii) وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوّأ منھا حیث یشاء . . . . وکانوا یتقون (۱۲/۵۶)

اور اس طرح ہم نے یوسف کو تمکن فی الارض عطا کر دیا کہ جس جگہ چاہے جب منشا کام چلائے . . . . یہ تقویٰ کا نتیجہ تھا۔

یعنی روزوں کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس قوم کو تمکن فی الارض عطا ہو اور ان کے اختیارات نہایت وسیع ہو جائیں۔

روزوں کی دوسری غایت یہ بتائی گئی کہ اس سے تم اس قابل ہو سکو گے کہ دنیا میں اللہ کے قانون کو سب سے بلند مقام پر رکھ سکو۔ قرآن نے امت مسلمہ کو بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے (شھداء علی الناس) اور اس طرح امام للناس (Leadership of Nations) کے منصب پر فائز ہو۔ یعنی نوع انسانی کے تمام تنازعات کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق کرے۔ یہی خدا کی کبریائی ہے۔ اس کا بول بالا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

روزوں کا تیسرا نتیجہ یہ بتایا لعلکم تشکرون۔ شکر بھی ایک جامع اصطلاح ہے لیکن اس کا مفہوم اس کے اشتقاق سے سمجھ میں آجائیگا۔ شکر کہتے ہیں بکری کے تھنوں کا اس قدر دودھ سے بھر جانا کہ معلوم ہو کہ ان میں سے دودھ ابھی ٹپک پڑیگا۔ لہٰذا مساعی کے مشکور ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ پورے پورے طریق پر ثمر بار اور نتیجہ خیز ہوں۔ کوششیں کس طرح ثمر بار اور مساعی کیسے نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق خود مسلمانوں کی مکی اور مدنی زندگی کا مقابلہ کر کے حقیقت کو نکھار کر سامنے لایا گیا۔ ارشاد ہے:۔

واذکروا اذ کنتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم وایدکم بنصرہ ورزقکم من الطیبات لعلکم تشکرون۔ (۸/۲۶)

وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد بھی بہت کم تھی اور ویسے بھی تم ملک میں بہت کمزور تصور کئے جاتے تھے۔ تم ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ اس کے بعد اللہ نے تمہیں ٹھکانا عطا کیا۔ اپنی نصرت سے تقویت بخشی اور نہایت عمدہ سامانِ رزق مہیا کر دیا تاکہ تمہاری مساعی مشکور ہوں۔

قرآن کی ان تصریحات پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائیگی کہ قرآن کی رُو سے روزوں کی غایت یہ ہے کہ

(۱) قوم کو اس قسم کی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہتا۔

(۲) انھیں اقوام عالم میں ایک امتیازی زندگی مل جاتی ہے۔

(۳) انھیں تمکن فی الارض عطا ہوتا ہے۔ ان کے اختیارات حدود فراموش ہو جاتے ہیں۔

(۴) انھیں اقوام عالم میں ایسا مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ تمام دنیا میں قانونِ خداوندی کے نافذ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(۵) ان کا ضعف۔ قوت سے، قلت۔ کثرت سے، نکبت و زبوں حالی۔ ثروت سے، اور افلاس و غربت۔ خوشحالی سے بدل جاتے ہیں۔

یہ ہے روزوں کی غایت جو قرآن نے بیان کی ہے۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ قرآن نے اسے محض بطور ایک نظریہ (Theory) کے بیان کر دیا ہو جس کے متعلق شبہ ہو کہ شاید یہ ممکن العمل بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ اس نے حضور ختمی مرتبتؐ اور جماعتِ مومنینؓ کی سیرت طیبہ سے (جسے قرآن نے اپنے آغوش میں محفوظ کر رکھا ہے) یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ایسا عمل ہے جس کے یہ نتائج لازمی طور پر سامنے آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت، اپنے گھر بار چھوڑ کر، پناہ گزینوں کی طرح مدینہ میں آ کر بیٹھی تھی۔ بے سروسامان، بے یار و مددگار۔ چاروں طرف سے ستائے ہوئے۔ ہر سمت سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے۔ ایسی حالت میں روزے فرض ہوئے۔ یعنی اس جماعت کو ایک نیا پروگرام عطا ہوا۔ ابھی اس پروگرام پر عمل کرتے ہوئے سترہ دن بھی نہ گزرنے تھے کہ بدر کے میدان میں اس پروگرام کے امتحان (Test) کا موقعہ آ گیا۔ اور ایک زمانے نے دیکھ لیا کہ وہی جماعت جو غریبوں اور مسکینوں کی طرح مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی تھی دشمن کی سب سے بڑی قوت پر غالب آ گئی اور اس طرح اس کا ضعف، غلبہ سے اور مسکینی و بے چارگی، سطوت و ثروت سے بدل گئی۔ اس کے بعد سے اس ملک میں تمکن عطا ہو گیا اور نہایت امتیاز کی زندگی جس میں کسی قسم کا خوف اور حزن باقی نہ تھا۔ وہ تھا قرآن کا دعویٰ کہ روزوں کے پروگرام سے اس قسم کی نتائج مرتب ہوں گے۔ اور یہ تھی اس دعویٰ کی عملی اور بدیہی دلیل کہ دیکھ لو ایک روزہ دار قوم کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے بدر کے دن کو یوم الفرقان کہا ہے۔

قرآن نے روزوں کے جو نتائج بتائے ہیں ان پر غور کرو۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ کسی زمانے میں وہ نتائج حرفاً حرفاً اسی طرح برآمد ہو کر سامنے آ گئے تھے یا نہیں؟ اور اس کے بعد اس پر غور کرو کہ کیا وہی نتائج آج بھی مرتب ہو رہے ہیں؟ اگر وہ نہیں ہو رہے تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہے۔ یعنی — (i) یا تو ان اعمال کے یہ نتائج اُس زمانے تک محدود تھے۔ اور یا

(ii) اس پروگرام پر صحیح طور پر عمل نہیں ہو رہا۔

پہلی صورت تو ہو نہیں سکتی۔ اسلئے کہ اگر یہی صورت تھی تو پھر نہ قرآن کو قیامت تک کیلئے محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی نہ نبوت کے ختم کرنے میں کوئی مصلحت۔ جب قرآن کو ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیا گیا ہے تو پھر اس کے متعین فرمودہ پروگرام کا آج بھی وہی نتیجہ

مرتب ہونا چاہیے جو قرنِ اول میں ہوتا تھا۔ اور اگر آج وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو پھر لامحالہ دوسری صورت ہی تسلیم کرنی پڑیگی۔ لیکن دوسری صورت اسلئے تسلیم نہیں کی جاتی کہ "مذہب" نے یہ حقیقت ہی نگاہوں سے اوجھل کردی ہے کہ قرآن نے ہمیں زندگی کا ضابطہ دیا ہے۔ اسلام کے خلاف جو سازش ہوئی تھی اس نے کیا ہی یہ تھا کہ قرآن نے جن امور کو زندگی کا پروگرام بتایا تھا اس نے کہدیا کہ یہ پوجا پاٹ کے طریقے ہیں! .... اور پوجا پاٹ کے معنی ہی یہ ہیں کہ تم ان رسموں کو ادا کرتے جاؤ۔ تمہارا یہی فریضہ ہے۔ ان کا "ثواب" اللہ کے ہاں "جاکر ملے گا۔ ان چیزوں کا دنیا کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کیلئے ان سازش کرنے والوں کو صرف اتنا کرنا پڑا کہ قرآن کی اصطلاحوں کا مفہوم بدل دیا۔ روزوں کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ ان کی غایت یہ ہے کہ (i) لعلکم تتقون - (ii) لتکبروا اللہ - اور (iii) لعلکم تشکرون - "مذہب" نے کہدیا کہ تقویٰ کے معنی ہیں پرہیزگاری۔ یعنی روزے میں کھانے پینے سے پرہیز کرو۔ لتکبروا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ عید کے دن اونچی اونچی تکبیریں کہتے ہوئے عیدگاہ تک جاؤ۔ اور لعلکم تشکرون کے معنی ہیں کہ اٹھتے بیٹھتے کہتے رہو "یا اللہ تیرا شکر"۔ دیکھا آپ نے کہ یہ سازش کسقدر نگاہ فریب اور سحر کار تھی؟ اس نے اسلام کے عطا فرمودہ زندگی کے پروگرام کے تمام اجزا کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا لیکن ان کے متعلق ذہن میں اتنی سی تبدیلی پیدا کردی کہ ان سے مقصود خدا کی پرستش ہے۔ "پرستش" کے نتیجے یہاں نہیں دیکھے جاسکتے۔ اس سے عاقبت میں "نجات" ہوگی۔ جس طرح وہ ان اعمال کی شکل و صورت میں تبدیلی نہیں کرسکتے تھے اسی طرح وہ قرآن کے الفاظ میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتے تھے۔ انھوں نے ان الفاظ کو علیٰ حالہ رکھا لیکن ان کا مفہوم بالکل اپنے مطلب کے مطابق بدل دیا۔ اس کی سند میں انھوں نے روایات تراش لیں۔ اسلئے کہ قرآن میں اضافہ ناممکن تھا لیکن روایات سازی کیلئے تو ہر وقت دروازہ کھلا تھا۔ ان روایات کا عمود ہی یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "عاقبت کی نجات" کے گورکھ دھندے میں الجھائے رکھیں اور دنیا کو ان کی نظروں میں حقیر و ذلیل قرار دیکر اسے "مردار خوروں" کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ مولوی بیچارا اس سازش کا فریب خوردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی سادہ لوحی اس سادہ و پرکار سازش کی حریف ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اب یہ سازش انہی روایات کے بل بوتے پر زندہ و پائندہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیچارا مسلمان اسقدر محنت اور مشقت کے باوجود اس قسم کی ذلت اور نکبت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

یاد رکھیے! اس سازش سے بچ نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہمیشہ اعمال کو ان نتائج سے پرکھو جو قرآن نے ان کیلئے متعین کئے تھے۔ اگر وہ اعمال اس قسم کے نتائج برآمد نہیں کرتے تو اپنے آپ کو فریب میں مت رکھو۔ سمجھ لو کہ وہ اعمال منشائے قرآن کے مطابق سرانجام نہیں پا رہے۔ جس وقت ان اعمال سے وہ نتائج مرتب ہوں جو قرآن نے بتا رکھے ہیں اور جو محمد رسول اللہ والذین معہ کے نقوش قدم میں چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، اسوقت سمجھئے کہ ہم اسلام کی صحیح اتباع کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں نوع انسانی کی امامت بھی نصیب ہو جائے گی اور یہی امامت ہماری عاقبت کی سرفرازی کا بھی موجب ہوگی۔ اسوقت فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کا قرآنی منظر لہلہاتا ہوا جنتِ نگاہ بن جائے گا۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

ماہِ نَو

ہے پیکِ انبساط یہ شمعِ حرم کی لَو
ہوتی ہے عید جب نظر آتا ہے ماہِ نَو

کیا رفعت آفریں ہے تماشائے ماہِ نَو
خاکی ہیں ہم لگی ہے مگر آسماں سے لَو

دوڑائی اس نے دل میں جو بجلی کی ایک رَو
شاید کہ برقِ طُور کا ٹکڑا ہے ماہِ نَو

منزل بہ منزل اس کی جو بڑھتی رہے گی ضَو
بن جائے گا کبھی مہِ کامل یہ ماہ نو

منزل سمجھ کے ٹھہر نہ جائیں جو راہ رو
ہر ہر قدم پہ آئیں مقاماتِ نَو بہ نَو

خوش فہمی اپنی دور ہو شاید پس از درو
گندم کے انتظار میں بیٹھے ہیں بو کے جَو

جب دل کوئی بھی فیصلہ کرلے تو عقل کو
تائید میں اسی کی دلیلیں ملیں گی سَو

معیارِ زندگی کی بلندی بجا مگر
یہ کیا کہ دس ابھرتے ہیں جب ڈوبتے ہیں سَو

دیکھو کسی میں عیب اگر چار پانچ چھ
پاؤ گے خوبیاں بھی وہیں سات آٹھ نَو

آزاد وہ جو اپنے ارادے سے چل سکے
یا وہ بہا چلے جسے آزادیوں کی رَو

کرتا ہے ہر قدم اسے منزل سے دور تر
اے وائے وہ جو راہِ غلط پر ہے تیز رو

سرگرمیوں پہ اہلِ جہنم کی ریجھ کر
ڈر ہے کہیں بہشت کو رکھ دیں نہ ہم گرو

ایں آزمائشے پئے انعامِ دیگر است
بر نعمتے کہ یافتۂ مطمئن مشو

اسدؔ ملتانی

قربانی

طلوعِ اسلام میں قربانی کے متعلق جو کچھ شائع ہوتا رہا، قارئین کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ اس کے جواب میں جو کچھ دیگر جرائد و رسائل میں شائع ہوا وہ بھی انھوں نے دیکھ لیا ہوگا۔ جب یہ چیزیں ہمارے سامنے آئی تھیں تو ہم نے محسوس کیا تھا کہ اس موضوع پر ذرا تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ اب جبکہ پھر قربانی کی عید قریب آرہی ہے، اس مسئلہ سے متعلق استفسارات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس سے تفصیلی گفتگو کی اہمیت اور بھی نمایاں طور پر سامنے آگئی ہے۔

پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ مسئلہ زیرِ غور کیا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ

(i) حج کے موقعہ پر حاجی مکہ معظمہ میں جانور ذبح کرتے ہیں جسے قربانی کہا جاتا ہے۔

(ii) ایک ایک حاجی متعدد جانور ذبح کرتا ہے۔ ان جانوروں کو گڑھے کھود کھود کر دبانا پڑتا ہے۔

(iii) عید کے موقعہ پر تمام دنیا کے مسلمان اپنی اپنی جگہ پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ اسے بھی قربانی کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کا حکم قرآن کریم سے بھی ملتا ہے یا یہ چیزیں یونہی رسماً چلی آرہی ہیں؟

اصل سوال تک پہنچنے سے پہلے، ایک چیز تمہیداً عرض کر دینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں مختلف وجوہات کی بنا پر صورت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ آپ "مذہب" سے متعلق کوئی بات، فلسفہ، منطق، تصوف، تفاسیر، روایات وغیرہ میں سے کسی کے حوالہ سے بھی کریں، اس پر کوئی معترض نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں آپ نے کسی موضوع کے متعلق یہ کہا کہ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے تو اس کے سنتے ہی اس قسم کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں گویا آپ نے الحاد اور بے دینی کی کوئی بدترین بات کہدی۔ ہم "مذہب" کے معاملہ میں یہودیوں کے افسانے، قصہ گوؤں کی داستانیں، یونانی فلسفہ کی قیاس آرائیاں، مجوسیوں کی آتش نوائیاں، ویدانت کے مہملات، برہمو سماجی قسم کے خرافات، حتیٰ کہ کسی مجذوب کی بڑ تک سننا تو گوارا کر لیں گے اور ان لغویات میں معانی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے لیکن جونہی کسی نے کہا کہ آؤ دیکھیں اس بارے میں قرآن کی کیا تعلیم ہے، تو ہم کوشش کریں گے کہ کوئی اس کی سننے نہ پائے، کیونکہ اس سے ایمان کی خرابی کا خطرہ اور عاقبت برباد ہو جانے کا اندیشہ محسوس ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ

چکے ہیں، یہ نتیجہ ہے اس منظم سازش کا جسے عجمی عناصر اسلام سے اپنا انتقام لینے کیلئے روبعمل لائے اور جس کی ہوا یہ کہ (اقبال کے الفاظ میں)

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ امت روایات میں کھو گئی

رفتہ رفتہ مسلمانوں کو قرآن سے اسقدر چڑھ ہو گئی کہ ان کے نزدیک خالص قرآن کی طرف دعوت الحاد اور زندقیت کے مرادف قرار پا گئی۔ اس سے بڑا انقلاب سورج کی آنکھ نے آجتک نہیں دیکھا اور نہ ایسی کامیاب سازش آسمان کے تاروں کی نگاہوں سے گذری ہوگی کہ جس کی رو سے ایک قوم اپنی آسمانی کتاب پر ایمان کا دعویٰ بھی رکھے لیکن جب یہ کہا جائے کہ اپنے معاملات میں اُس کتاب کو حکم قرار دو تو ایسا کہنے والے کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیدیا جائے۔ ہماری بدقسمتی سے ہزار برس سے ہماری مساجد کے منبر اور خانقاہوں کے حجرے، نادانستہ طور پر اس سازش کی آماجگاہ بنے چلے آرہے ہیں اور اپنی سادہ لوحی سے اس سازش کو محکم سے محکم تر بنانے کی ہر کوشش کو "دین کی خدمت" تصور کر کے امت سے اس کے اجر کا مطالبہ کرتے ہیں اور فریب خوردہ امت اس مطالبہ کے پورا کرنے میں سعادتِ دارین محسوس کرتی ہے۔ اس قسم کی سادہ لوحی کی مثال تاریخ کے صفحات میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

بنا بریں جو لوگ ابھی تک (دانستہ یا نادانستہ) اس سازش کے علمبردار یا اس کے دامِ فریب میں گرفتار ہیں، ان سے تخاطب بیکار ہے، لیکن جو سعید روحیں یہ سمجھ چکی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا ذمہ اس لئے لیا تھا کہ اسے قیامت تک مسلمانوں کا ضابطۂ حیات بننا تھا، ہم انھیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ قرآن کا اس باب میں کیا حکم ہے اس تفصیلی گفتگو کا محرک یہی جذبہ ہے۔

سوال آپ کے سامنے آچکا۔ اب دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کیلئے کہیں "قربانی" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے اسے خاص طور پر قرب الٰہی کا ذریعہ قرار دیا ہے[1]۔ یہ تصور کہ جانوروں کے خون بہانے سے خدا خوش ہوجاتا ہے اس لئے "قربانی" وجہ تقربِ خداوندی ہوتی ہے، غیر قرآنی تصور ہے۔ آج ہمارے ہاں قربانی کے ساتھ یہی تصور وابستہ ہے اور یہ اسی سازش کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے اور جس نے اسلام جیسے زندگی بخش نظامِ حیات کو محض رسومات کا مجموعہ بنا چھوڑا ہے۔

---

[1] ہم نے "خاص طور پر" اسلئے لکھا ہے کہ قرآن جو ضابطۂ حیات متعین کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے (یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے جیو سے) سے انسان کے اندر صفات خداوندی کی مماثل صفات نشوونما پاکر پورے طور پر (Develop) ہوجاتی ہیں۔ اس کا نام "قرب الٰہی" ہے۔ اس اعتبار سے ضابطۂ قرآنی کا ہر گوشہ باعث قرب الٰہی ہے۔ اور اس نہج سے حج اور اس کے قرآنی شمولات جو اس ضابطہ کے لاینفک جزو ہیں عمومی حیثیت سے قرب الٰہی کا موجب ہیں۔

قرآن جس تمدنی نظام (Social order) کی تشکیل چاہتا ہے اس کا نقطۂ آغاز صلوٰۃ ہے اور منتہیٰ حج۔ یعنی ملت کی چھوٹی چھوٹی وحدتوں (Units) کی صحیح تعمیر سے شروع کرکے پوری کی پوری ملت کو ایک مرکزِ وحدانیت پر جمع کرنا۔ انھیں قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانا۔ اور اس کے بعد اس ضابطۂ حیات کو ساری دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ بنانا۔ حج، ملت کے اس عظیم القدر اجتماع کا نام ہے جس میں قرآنی نظامِ حیات کے پروگرام پر غور و خوض کرکے اسے نافذ العمل بنانے کی تراکیب کو سوچا جاتا ہے۔ اس اجتماع کا مرکز بیت الحرام (خانہ کعبہ) ہے جو ملتِ اسلامیہ کا مرکزِ محسوس ہے۔ اس عظیم الشان اجتماع کو کامیاب بنانے میں ہر کوشش مبارک اور ہر اقدام مسعود ہے۔ قرآن کریم میں جانوروں کے ذبح کرنے کا ذکر اسی اجتماع کے سلسلہ میں آیا ہے اور وہ آیات حسب ذیل ہیں۔ (ان آیات پر الگ الگ نمبر بھی دیدئے گئے ہیں تاکہ آئندہ حوالہ میں سہولت ہو۔ نیز ان کا ترجمہ مروجہ تراجم کے مطابق ہی کر دیا گیا ہے تاکہ یہ اعتراض نہ پیدا کر دیا جائے کہ ہم نے (خدانکردہ) اپنے مطلب کے مطابق معانی پیدا کرنے کے لئے ترجمہ کچھ سے کچھ کر دیا ہے)۔

سورۃ الحج میں ہے:۔

(۱) وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۞ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ۔ (۲۲/۲۷-۲۸)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز رستوں سے پہنچی ہونگی۔ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے موجود ہوں اور تاکہ ایام مقررہ میں ان چوپاؤں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انھیں عطا کئے ہیں۔ سو جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

ان جانوروں کے متعلق آگے چل کر یوں ارشاد ہے۔

(۲) لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (۲۲/۳۳)

ان جانوروں میں تمہارے لئے ایک مدتِ معینہ تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اسکے بعد ان کے حلال کرنے کی جگہ بیت عتیق (خانہ کعبہ) کے قریب ہے۔

اس سے آگے ہے:۔

(۳) وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (۲۲/۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں[1] کو ہم نے اللہ کے دین کی یادگار بنایا ہے ان جانوروں میں تمہارے لئے (اور بھی) فائدے ہیں۔ سو تم انھیں

[1] جس لفظ کا ترجمہ "قربانی کے اونٹ" کیا گیا ہے وہ لفظ بُدْنٌ ہے۔ بَدُنَ کے معنی ہیں موٹا۔ فربہ۔ بُدْنٌ جمع ہے بَدَنَۃٌ کی جس کے معنی فربہ اونٹ [illegible]

کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لیا کرو۔ پس جب وہ کسی کروٹ گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے محتاج کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

اور اس کے بعد ہے:۔

④ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۲/۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون۔ لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس پر جس کی اس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ اور محسنین کیلئے بشارت ہے۔

یہ سورۂ حج کی آیات ہیں۔ انھیں دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ یہ مسئلہ پیش نظر کے متعلق کس قدر صاف اور واضح ہیں۔

آیت ① میں سلسلۂ کلام کا آغاز ہی اعلانِ حج سے ہوتا ہے۔ اور اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرو اور ان میں سے خود بھی کھاؤ اور حاجتمندوں کو بھی کھلاؤ۔

آیت ② سے واضح ہے کہ یہ وہ جانور ہیں جن سے پہلے عام جانوروں کا کام لیا جاتا ہے۔ ان پر سواری کرکے یا بوجھ لاد کر، حج کے لئے آیا جاتا ہے اور پھر انھیں حج کی تقریب پر مکہ معظمہ میں ذبح کیا جاتا ہے۔

آیت ④ بھی آیت ② کے مضمون کی تائید کر رہی ہے۔ یعنی ان جانوروں کے فوائد (خیر) اور اس کے بعد ذبح کرکے خود بھی کھانا اور محتاجوں کو بھی کھلانا۔ (ان کے شعائر اللہ ہونے کا بیان آگے چل کر آئے گا)۔

آیت ④ میں اس غلط تصور کا بطلان کیا گیا ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا تھا کہ قربانی کی حیثیت افادی نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی ہے جو خون بہانے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے قربانی کے جانور ذبح کرکے چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس کے برعکس یہ واضح کر دیا گیا کہ ان جانوروں کے ذبح کرنے سے مقصود خون بہا کر خدا کو خوش کرنا نہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان کا گوشت تمہارے اور دیگر ضرورتمندوں کے کام آئے۔ اللہ کے نزدیک قابل قدر چیز تمہارا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی تشریح اگلے الفاظ سے کر دی جن میں بتا دیا گیا کہ تمہارا مقصود حیات یہ ہے کہ جس ضابطۂ حیات کی طرف تمہاری راہ نمائی کی گئی ہے اسے متشکل اور مستحکم کرو اور اس طرح دنیا میں قانونِ خداوندی کی عظمت اور کبریائی کو ثبت کرکے دکھا دو۔ اجتماع حج اسی مقصد کے حصول کی کڑی ہے اور یہ جانور اس اجتماع میں شامل ہونے والوں کے خورونوش کا ذریعہ بنتے ہیں۔

قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ ایک وہ جو ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (مسلم) اور دوسری وہ جو اس کے علاوہ دیگر ضوابط زندگی کو اپنا مسلک بنائیں (غیر مسلم)۔ قرآن ان دونوں جماعتوں میں واضح اور غیر مبہم امتیازی خطوط قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ

وہ زندگی کے ہر شعبہ میں بآسانی پہچانے جاسکیں۔ چنانچہ ہر وہ عمل یا وہ شے جو اس قسم کی پہچان کرا سکے شعائر اللہ کہلاتی ہے۔ شعار اس خاص نشان کو کہتے ہیں جو جنگ میں استعمال کیا جائے تاکہ اس سے اپنے رفیق اور دوست پہچانے جاسکیں۔ حج تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکزی اجتماع اور یک قلبی اور یک نگہی کا عملی مظاہرہ اور ایک ضابطۂ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کی تعارفی تقریب ہے۔ اس سے بڑا دوستوں اور رفیقوں کا اجتماع اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اس لئے حج کے تضمنات (صفا و مروٰی اور بُدن وغیرہ) کو خصوصیت سے شعائر اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:-

⑤ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ (۵/۲)

اے ایمان والو۔ بے حرمتی نہ کرو شعائر اللہ کی اور نہ حرمت والے مہینے کی، نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو بیت الحرام کے مقصد سے جا رہے ہوں اور اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں۔

چونکہ حج سے مقصود، دنیا میں قوانینِ خداوندی کا عملی نفاذ ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نوعِ انسانی میں صحیح توازن پیدا ہو جائے گا اور اس طرح انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں بیت الحرام کو وجۂ قیام انسانیت قرار دیا ہے اس کے ساتھ ہی تضمنات کو بھی انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:-

⑥ جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ... (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو، جو کہ حرمت والا مکان ہے، لوگوں کے قیام کا باعث قرار دیا ہے اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں۔

آیات ۱ تا ۴ کو پھر سے سامنے لائیے۔ ان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رو سے

(۱) قربانی صرف حج کے موقعہ پر ہے۔

(۲) قربانی کا مقام مکہ معظمہ ہے جہاں حج ہوتا ہے۔

(۳) قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ان جانوروں کا گوشت کھایا جائے۔

(۴) یہ سمجھنا کہ جانور ذبح کرنے سے قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے، غلط ہے۔

ان حقائق سے یہ واضح ہو گیا کہ

(ا) حج کے علاوہ اور کسی تقریب پر قربانی کا ذکر نہیں۔

(ب) مکہ معظمہ کے علاوہ اور کسی مقام پر قربانی نہیں۔

(ج) جس جانور کا گوشت کھانے کے کام نہ آئے اُسے قربانی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کا صرف خون بہایا گیا ہے اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا۔ لہٰذا ایسا کرنا اسراف ہے یعنی بے نتیجہ اور بے مصرف ایک جانور کا ضائع کر دینا۔

فلہٰذا۔

(ا) حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کر کے مٹی میں دبائے جانا منشائے قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ اور

(ا) یہ جو عید کی تقریب پر دنیا بھر کے شہروں میں قربانیاں دی جاتی ہیں ان کا حکم تو ایک طرف کہیں ذکر تک بھی قرآن میں نہیں۔ بلکہ یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب قرآن نے قربانی کے مقام کو بالتصریح معین کر دیا ہے تو اس معین کو عام کر دینا قرآنی منشا کے خلاف ہے۔ مثلاً قرآن نے نماز کے لئے سمت قبلہ کو معین کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہر طرف منہ کر کے نماز پڑھنا قرآنی حکم کے خلاف ہوگا۔

اب دیگر آیات دیکھئے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

۵ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ (۲/۱۹۶)

اور حج اور عمرہ کو اللہ کیلئے پورا کرو۔ پھر اگر تم (کسی وجہ سے) روک دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو بھی میسر آئے (خانہ کعبہ کو بھیجدیا کرو)۔ اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک قربانی کا جانور اپنے موقعہ پر نہ پہنچ جائے (اور وہ موقعہ حرم ہے) اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزے ہے یا صدقہ یا نسک (قربانی) پھر جب امن کی حالت ہو جائے تو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر دونوں سے متمتع ہو تو جو کچھ قربانی میسر ہو ذبح کرے۔ پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو اس کے ذمے تین دن کے روزے ایام حج میں، اور سات دن کے جب حج سے لوٹنے کا وقت ہو، یہ پورے دس ہوئے یہ اس کے لئے ہے جس کے اہل و عیال کعبہ کے قریب نہ رہتے ہوں۔

ان آیات میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ حج اور عمرہ[1] میں، عام حالات میں قربانی کا حکم نہیں۔ ضرورت کے مطابق، باہمی مشاورت سے

---

[1] حج تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندگان کی سالانہ کانفرنس ہے اور سال بھر میں وقتاً فوقتاً جو کانفرنسیں کی جائیں وہ عمرہ ہیں۔

خورد و نوش کے لئے جانور ذبح کئے جائیں گے۔

لیکن حسب ذیل اسباب میں سے کوئی سبب پیدا ہو جائے تو ھدی یا نسک کا حکم ہے (ان الفاظ کے معانی آگے چل کر آتے ہیں)۔

(۱) کسی شخص نے حج یا عمرہ کا ارادہ کر لیا لیکن وہ محصور ہو گیا اور خانہ کعبہ تک نہیں پہنچ سکا تو اسے چاہئے کہ اپنے ھدی کو کسی کے ہاتھ بھیجدے۔ جب ھدی مکہ میں پہنچ جائے پھر حجامت بنوا کر احرام سے باہر نکل آئے اس سے پہلے حجامت نہ بنوائے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ حالت احرام میں (جبکہ حجامت بنوانا منع ہے) کسی تکلیف کے سبب حجامت بنوانے کیلئے مجبور ہو جائے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا نُسک۔

(۳) تیسرا یہ کہ حج اور عمرہ ایک ساتھ کرے تو اس صورت میں ھدی دے۔ اور اگر یہ میسر نہ ہو تو دس دن کے روزے رکھے۔

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان مقامات پر بھی صرف قربانی کا حکم نہیں ہے۔ سبب اول کے ماتحت اتنا بتا دیا گیا ہے کہ عازم حج بحالتِ معذوری (محصور ہو جانے کی شکل میں) کیا کرے۔ اس صورت میں وہ اپنے ھدی کو کعبہ تک بھیجدے۔ سبب دوم میں روزے یا صدقہ یا نسک کا حکم ہے۔ اور سبب سوم میں ھدی کا حکم ہے بشرطیکہ وہ میسر آجائے۔ اگر میسر نہ آئے تو پھر روزے رکھ لے۔

ان آیات میں ھدی اور نسک کے الفاظ آئے ہیں۔ ھدی جمع ہے ھَدِیَّۃ کی جس کے معنی ہیں تحفہ۔ خود قرآن میں ہے بل انتم بھدیتکم تفرحون (۲۷/۳۶) اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ھدی صرف قربانی کے جانور ہی ہوں۔ "فما استیسر من الھدی" نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی تحائف میں سے جو کچھ بھی میسر آجائے اُسے کعبہ بھیجدے تاکہ وہاں جمع ہونے والوں کے کام آئے عربوں کے ہاں بہترین تحائف ان کے جانور تھے۔ اسلئے وہ جانوروں کو بطور تحائف پیش کرتے تھے لیکن ضروری نہیں کہ تحائف صرف جانور ہی ہوں۔ لہٰذا آیاتِ بالا سے مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی عازم حج راستہ میں گھر جائے تو اپنے تحائف کعبہ بھیجدے۔ اسی طرح جو شخص حج اور عمرہ سے اکٹھا متمتع ہو اور اسے کوئی تحفہ میسر آسکے تو اسے پیش کر دے ورنہ روزے رکھ لے۔ اسی طرح نسک کے معنی بھی صرف قربانی نہیں۔ نسک چاندی کے خالص ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔ اخلاص کی بنا پر اس سے مفہوم عام عبادات لیا جاتا ہے (تفصیل آگے چل کر آئے گی) پھر ذبیحہ کو بھی نسک کہنے لگ گئے۔

لیکن قطع نظر اس کے، اگر ھدی اور نسک سے مراد قربانی کے جانور ہی لئے جائیں تو بھی آیاتِ بالا سے یہ واضح ہے کہ ان کا مقام کعبہ ہی ہے۔ انھیں وہیں پہنچانا ہوگا۔ (حتی یبلغ الھدی محلہ) اور وہیں یہ ذبح ہوں گے تاکہ ان سے اجتماع حج میں شریک ہونیوالے خورد و نوش کا کام لیں۔ اس حقیقت کو دوسرے مقام پر اور بھی واضح کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص دانستہ کسی جان کا قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کی مثل ایک ایسا جانور دے جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کر دیں۔ ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ (۵/۹۵) اس ہدیہ[1] کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ھدیہ کو کعبہ ہی پہنچانا ہوگا۔

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

آیاتِ بالا سے پھر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے۔ کعبہ کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں۔

اب ایک آیت اور دیکھئے جس سے اس حقیقت کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ قربانی کا مقام خانہ کعبہ ہی ہے۔ سنہ ۶ھ میں رسول اللہ عمرہ ادا کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے عازم مکہ ہوئے۔ لیکن قریش مکہ نے حضور کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ حدیبیہ کا مقام تھا جہاں وہ مشہور صلحنامہ لکھا گیا جسے قرآن نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں ہے:-

⑤ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ - (۴۸/۲۵)

یہ (قریش مکہ) وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا۔ نیز قربانی کے جانوروں (ھدی) کو روک دیا کہ وہ اپنے حلال ہونے کی جگہ تک نہ پہنچ سکیں۔

ہمارے پیش نظر سوال یہ تھا کہ کیا قرآن نے قربانی کے مقام کو معین کر دیا ہے یا اسے غیر معین چھوڑ دیا ہے کہ مسلمان جہاں چاہیں (اپنے اپنے مکانوں اور گلی کوچوں میں) قربانی دے دیا کریں۔ قرآن کی تمام متعلقہ آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں آپ انھیں ایک مرتبہ پھر دیکھ لیں اور خود فیصلہ کر لیں کہ اس باب میں قرآن کا حکم معین ہے یا اس نے اس چیز کو غیر معین چھوڑ دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ

(i) آیت ۲ میں قربانی کے جانوروں کے متعلق تصریح موجود ہے کہ

ثم محلها الی البیت العتیق۔ ان کے حلال کرنے کی جگہ خانہ کعبہ ہے۔

(ii) آیت ۷ میں (اگر ھدی سے مراد قربانی کے جانور لئے جائیں تو) بصراحت فرما دیا کہ

حتی یبلغ الھدی محلہ۔ جب تک قربانی کے جانور اپنے ذبح ہونے کے مقام پر نہ پہنچ جائیں۔

(iii) آیت ۵ میں فرمایا

ھدیا بالغ الکعبۃ۔ قربانی کے جانور کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔

(iv) آیت ۸ میں ارشاد ہے کہ قریش مکہ نے قربانی کے جانوروں کو روک دیا۔

ان یبلغ محلہ۔ کہ وہ اپنے ذبح ہونے کے مقام تک نہ پہنچنے پائیں۔

(v) باقی آیات میں قربانی کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں۔

حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ:-

۱ آیت ۷ میں اشرف علی صاحب تھانوی نے ھدی کا ترجمہ قربانی کیا ہے۔ لیکن اس مقام پر انھوں نے ھدیا کا ترجمہ نیاز کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "بشرطیکہ اسے نیاز کے طور پر کعبہ پہنچایا جائے"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ھدی کے معنی صرف قربانی کے جانور نہیں بلکہ ہر وہ تحفہ ہے جسے تقریب حج میں پیش کیا جائے۔

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ قرآن کریم کی ایسی کھلی ہوئی صراحت کے بعد اس بات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی باقی رہ سکتی ہے کہ قربانی کا مقام کونسا ہے؟ اگر قرآن صرف اتنا ہی کرتا کہ قربانی کے جانوروں کا ذکر حج کی تقریب کے ضمن میں کر دیتا تو بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی کہ قربانی مکہ ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن اس نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بار بار اس کی بھی تصریح فرما دی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے۔ اگر اس کے بعد بھی اس باب میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ نہیں! قربانی ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے، تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ ومن یضلل اللہ فلا ھادی لہ۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ جو حضرات، قرآن کی ان تصریحات کے باوجود قربانی کو ہر گلی کوچے میں عام کرتے ہیں، ان کے دلائل اور قرآن کی مندرجہ صدر کھلی ہوئی حقیقت کے خلاف ان کے اعتراضات کیا ہیں۔ اس باب میں اسوقت ہمارے سامنے سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ مضمون ہے جس میں انھوں نے سالِ گذشتہ، قرآن کی مذکورہ صدر تصریحات کو "فتنہ" قرار دیکر ان کی تردید فرمائی تھی [اور جو روزنامہ انجام (کراچی) کے عید ایڈیشن (مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء) میں شائع ہوا تھا]۔ اس مضمون میں انھوں نے خاص طور پر یہ احتیاط برتی ہے کہ اس میں ان آیات کا کوئی ذکر تک نہ آنے پائے جن میں قرآن کریم نے بہ صراحت قربانی کے مقام کو مکہ معظمہ کے ساتھ مختص کیا ہے اور جنھیں ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ اس خصوصی احتیاط کے بعد وہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

> سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ قربانی کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ کیا وہ قربانی کو صرف حج اور متعلقات حج تک محدود رکھتا ہے یا دوسرے حالات میں بھی اس کا حکم دیتا ہے۔ اس باب میں دو آیتیں بالکل صاف ہیں جن کا حج سے کوئی تعلق نہیں پہلی آیت سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔
>
> اے نبی کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت خم کرنے والا ہوں۔
>
> یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی جبکہ نہ حج فرض ہوا تھا اور نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے۔ اور اس میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے۔ نسک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال کیا گیا ہے، قرآن مجید میں دوسری جگہ قربانی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو البقرہ ۲۲۔
>
> تم میں سے جو شخص سفر حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوالے تو صدقے میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔ [ملاحظہ ہو آیت ۷ جس میں لفظ نسک آیا ہے۔ طلوع اسلام]

مودودی صاحب نے جس آیت کا ترجمہ لکھا ہے وہ آیت سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔ فرمایا:-

⑨ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

کہدو۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیم کا طریقہ کہ خدا ایک ہی کے لئے ہو جانا اور ابراہیم ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

حَنِیْفًا (ایک خدا کے لئے ہو جانا) کی تشریح اگلی آیت میں یوں ہے:۔

⑩ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

کہدو۔ میری نماز، میرا نسک، میرا مرنا، میرا جینا، سب کچھ اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں (یعنی خدا کے فرمانبرداروں میں) پہلا فرمانبردار ہوں۔

اور اس "توحید" کی مزید تشریح اس طرح فرما دی کہ

⑪ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۶/۱۶۴-۱۶۳)

کہئے! کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پروردگار ڈھونڈوں حالانکہ وہی ہر شے کا پرورش کرنے والا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں لفظ نُسُکی کا ترجمہ ہے "میری قربانی"۔ اس لئے اس سے قربانی کا حکم ظاہر ہے۔ ہم نے مندرجہ بالا ترجمہ میں (جو ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمہ ہے) لفظ نسک کو علیٰ حالہ رہنے دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس لفظ کے لغوی معنی "چاندی کے خالص کئے ہوئے ٹکڑے" ہیں۔ اس اخلاص کی جہت سے "عبادت گذار کو ناسک کہنے لگے کیونکہ وہ اپنے نفس کو چاندی کے ٹکڑے کی طرح گناہوں کی میل سے صاف کرتا ہے"[1]۔ قرآن کریم میں نسک، منسک، مناسک کے الفاظ (ان دو آیتوں کے علاوہ جن کا ترجمہ مودودی صاحب نے لکھا ہے) حسب ذیل مقامات پر آئے ہیں:۔

⑫ سورۂ بقرہ میں دعائے ابراہیمی واسماعیلی۔ وارنا مناسکنا۔ (۲/۱۲۹)

⑬ سورۂ بقرہ میں حج کے ضمن میں۔ فاذا قضیتم مناسککم (۲/۲۰۰)

(۱۴ و ۱۵) سورۂ حج میں۔ لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ (۲۲/۶۷) و (۲۲/۳۴)

دیکھئے کہ ان آیات میں ان الفاظ کا ترجمہ مختلف مترجمین نے کیا کیا ہے۔

---

[1] نسک کے معنی زمین شور کو درست کر کے زراعت کے قابل بنانے کے ہیں۔ چنانچہ ارض ناسکہ اس سرسبز زمین کو کہتے ہیں جس پر تازہ بارش برسی ہو۔ صلاۃ کے معنی خدا کے پیچھے پیچھے رواں دواں چلنا ہے۔ مصلی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں اس انداز سے دوسرے نمبر پر آئے کہ اس کے کان اول نمبر کے گھوڑے کی پشت کے ساتھ ساتھ آ رہے ہوں۔ ان معانی کے پیش نظر آیت نمبر ۱۰ کا صحیح قرآنی مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں۔ یہ آیت بڑی اہم ہے۔

آیت ۱۲۸ : "مناسکنا" کا ترجمہ مختلف تراجم میں اس طرح آیا ہے:-

شاہ عبدالقادرؒ - عبادات کی طرح

شاہ رفیع الدینؒ - طرح عبادت کی۔

جلالین - شرائع عبادتنا (یہ اردو ترجمہ نہیں لیکن مفہوم واضح ہے)

ابوالکلام صاحب آزاد - عبادت کے سچے طور طریقے۔

آیت ۱۲۸ : "مناسککم"

شاہ عبدالقادرؒ - عبادتیں اپنی

شاہ رفیع الدینؒ - عبادتیں

جلالین - عبادات، حج

ابوالکلام صاحب آزاد - حج کے تمام ارکان

آیات ۱۴ و ۱۵ : "منسک"

شاہ عبدالقادرؒ - طرح عبادت کی

شاہ رفیع الدینؒ - عبادت کی طرح

جلالین - شریعت (آیت ۳۴ میں اس کے ساتھ "قربانی کی جگہ" بھی آیا ہے)

ابوالکلام صاحب آزاد - عبادت کا طور طریقہ

اس کے بعد وہ آیت لیجئے جسے مودودی صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے یعنی "ان صلاتی ونسکی" (۶/۱۶۲)۔ اور جس میں انھوں نے نسکی کا ترجمہ "میری قربانی" کیا ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ مذکورہ صدر مترجمین نے حسب ذیل کیا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ - عبادتیں

شاہ رفیع الدینؒ - عبادتیں

جلالین - عبادات من حج۔ (حج کی عبادات)

ابوالکلام صاحب آزاد - میرا حج

یہ ہیں لفظ نسک کے معانی اس آیت میں جسے مودودی صاحب نے وجوب قربانی میں بطور نصِ قرآنی پیش کیا ہے اور جس کا ترجمہ انھوں نے "قربانی" کیا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ اس کے معنی "عام عبادات" لیتے ہیں اور تفسیر جلالین اور ترجمان القرآن ابوالکلام صاحب آزاد

ہیں اس کے معنی حج یا حج سے متعلقہ مراسم لکھے ہیں۔ [اور وہ جو کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے] خود مودودی صاحب نسک کا ترجمہ "قربانی" لکھ کر ایک ہی سطر بعد "مناسک" کے معنی "حج کے مراسم" بیان فرماتے ہیں۔ ان کا جو اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے اسے ایک بار پھر پڑھیے۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ دکھائی دیں گے۔

> یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ نہ حج فرض ہوا تھا نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے۔

"حج کے مراسم و مناسک" لکھ کر مودودی صاحب نے خود بتا دیا کہ "مناسک" کے معنی عام قربانی نہیں، حج کے طور طریقے ہیں۔ لہذا اگر "مناسک" کے معنی خود مودودی صاحب کے الفاظ میں "حج کے عام طور طریقے" ہیں تو آیت "ان صلاتی ونسکی" میں نسک کے معنی عیدالاضحیٰ کی قربانی کس طرح کئے جا سکتے ہیں؟

اب مودودی صاحب کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے جس میں ارشاد ہے کہ

> منسک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے اسے قرآن مجید میں دوسری جگہ "قربانی ہی" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو البقرہ ع۲۴۔
>
> تم میں سے جو شخص سفر حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوالے تو فدیہ میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔

(اس آیت کے الفاظ آیت ۶ میں دیکھئے)۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے نسک کے لفظ کے لئے قرآن کریم کی صرف وہی آیت نقل فرمائی ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ نسک سے مفہوم قربانی لیا جا سکتا ہے۔ دیگر مقامات کا (جہاں واضح ہے کہ نسک یا منسک یا مناسک کے معنی قربانی نہیں لئے جا سکتے) انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔

آیت ۶ میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ نسک کے معنی ضروری نہیں کہ قربانی ہی لئے جائیں۔ لہذا ایک ایسے مقام کو بطور سند پیش کرنا جس میں مختلف معانی کی گنجائش ہو، دلیل قطعی نہیں قرار دی جا سکتی۔ لیکن آیت ۶ میں نسک کے معنی "قربانی" ہی لئے جائیں تو وہیں یہ بھی تو موجود ہے کہ یہ حج کے احکام ہیں۔ اس لئے اس "قربانی" سے مراد وہ قربانی ہے جو خانہ کعبہ میں حج کے موقعہ پر دی جاتی ہے۔ لہذا اگر نسک کے معنی "قربانی" لئے جائیں تو اس کے صحیح معنی ہوں گے "وہ قربانی جو حج میں کی جائے"۔ اسلئے کہ جب قرآن خود کسی مفہوم کو معین کر دے تو اس مفہوم کو اسی طرح سے لینا چاہیئے جس طرح قرآن بیان کرتا ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ

(۱) "ان صلاتی ونسکی" میں نسکی کے معنی "میری قربانی" نہیں۔ اس لئے یہ آیت قربانی کے حکم کے لئے بطور نص قرآنی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور

(۲) اگر اس لفظ کا ترجمہ "قربانی" ہی کرنا ہو تو اس سے مراد ہوگی وہ قربانی جو حج میں کی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کی جس آیت (۶) سے

نسک کے معنی "قربانی" لئے گئے ہیں وہاں نسک کے معنی وہ قربانی ہے جو حج میں کی جاتی ہے۔ نہ کہ ہر گلی کوچے کی قربانی۔

چنانچہ علامہ حمید الدین فراہیؒ جنھوں نے اس آیت میں نسکی کے معنی "میری قربانی" لئے ہیں فرماتے ہیں:۔

بالاتفاق تمام مفسرین کے نزدیک اس آیت میں نسک سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔

لغت عرب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

باقی رہی مودودی صاحب کی یہ دلیل کہ چونکہ یہ آیت (ان صلاتی ونسکی . . .) مکہ میں نازل ہوئی تھی جب حج فرض نہیں ہوا تھا، اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں۔ واس کے متعلق پہلی چیز قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب نزولی نہیں ہے اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کونسی آیت کب نازل ہوئی تھی۔ خود یہ حقیقت کہ قرآن کی ترتیب نزولی نہیں اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ترتیب نزولی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ نزول کی ترتیب سے ہم قرآنی تعلیم کے "تدریجی ارتقا" کو معلوم کر سکتے ہیں۔ سو اول تو یہ کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اگر یہ چیز ایسی اہم ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ قرآن کی ترتیب نزولی رہنے دیتا۔ قرآنی تعلیم زمان اور مکان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر حالت میں زندگی بخش ہونے کیلئے دی گئی ہے۔ اسلئے وہ ترتیب نزول اور شانِ نزول وغیرہ کے اختصاصات میں مقید نہیں رکھی جا سکتی۔ جو کچھ قرآن میں موجود ہے وہ ہر زمانے کیلئے ضابطۂ حیات ہے۔ جس قسم کے حالات ہوں گے اسی قسم کے احکام نافذ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ترتیب نزول کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ دوسرے یہ کہ ترتیب نزول کے متعلق جو روایات ملتی ہیں وہ باہم دگر مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ کتب تفاسیر اٹھا کر ان میں کسی سورت کے نزول کے متعلق دیکھئے۔ آپ کو کئی مختلف روایات ملیں گی۔ کبھی پوری کی پوری سورت کے متعلق اختلافات ہوتے ہیں کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی یا مدینہ میں۔ کبھی ایک سورت کی مختلف آیات کے متعلق اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض آیات ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئیں تو انھیں مکی لکھ دیا گیا۔ خود سورۂ انعام (جس میں آیت "ان صلاتی و نسکی . . . ہے) کی بعض آیات کے متعلق اختلاف ہے کہ مکی ہیں یا مدنی۔ اسلئے اس سورت کو مکی قرار دیکر اس سے نتیجہ زیر نظر اخذ کرنا، محکم دلیل قرار نہیں پا سکتا۔ بہرحال یہ سورت مکی ہو یا مدنی۔ جو حضرات اس سے "قربانی" مراد لیتے ہیں وہ (جیسا کہ علامہ فراہیؒ نے لکھا ہے) اس امر پر متفق ہیں کہ نسک سے مراد وہ قربانی ہے جو حج اور عمرہ میں کی جاتی ہے۔

لیکن قطع نظر اور دلائل کے، مودودی صاحب کا یہ بیان کہ یہ سورت مکی ہے خود ہمارے دعوے کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسا کہ قرآن نے بصراحت فرما دیا ہے، قربانی کا محل مکہ معظمہ ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ قربانی کا ذکر اس سورت میں آیا ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہؐ مکہ میں تشریف فرما تھے اسلئے حضور لامحالہ مکہ ہی میں قربانی کرتے ہوں گے۔ اور یہی ہم کہتے ہیں۔

باقی رہا یہ کہ اُس زمانہ میں ابھی حج فرض نہیں ہوا تھا۔ تو اس سے مسئلہ زیر نظر پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حج فرض ہونے سے پہلے

بھی حضورؐ سنتِ ابراہیمیؑ کی اتباع میں اپنے طور پر حج کرتے تھے۔ (سارا عرب حج کیا کرتا تھا اگرچہ اس کا حقیقی مقصد ان کی نگاہوں سے فوت ہو چکا تھا اور اس کے مناسک میں مشرکانہ رسوم داخل ہو چکی تھیں) لہٰذا جب رسول اللہؐ حج کرتے تھے تو قربانی بھی حج کی تقریب پر ہی ہوتی ہوگی۔ مشرکین، بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کرتے تھے۔ حضورؐ انھیں اللہ کے نام پر ذبح کر کے خود کھاتے اور محتاجوں کو کھلاتے ہونگے۔

لہٰذا اس دلیل سے بھی واضح ہے کہ قربانی مکہ ہی میں ہوتی تھی اور حج کی تقریب پر۔ [اس باب میں ابھی ایک نکتہ باقی ہے جو "وانحر" کے سلسلہ میں ذرا آگے چل کر بیان ہوگا۔]

اب وہ دوسری آیت دیکھئے جسے مودودی صاحب نے اپنے دعوے کی دلیل میں پیش فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

دوسری آیت سورۂ کوثر میں ہے جس کا ترجمہ ہے۔

پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر

یہ آیت بھی مکی ہے اور اس میں بھی کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کیلئے خاص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اہلِ لغت نے نحر کے معنی سینے پر ہاتھ باندھنے۔ قبلہ رخ ہونے اور اول وقت نماز پڑھنے کے بھی بیان کئے ہیں۔ لیکن یہ سب دور کے معنی ہیں۔ عام فہم عربی میں اس لفظ کا مفہوم قربانی کرنا ہی لیا جاتا ہے (اس کے بعد مودودی صاحب نے احکام القرآن کا حوالہ دیا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام مترجمین شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا اشرف علی صاحبؒ، ڈپٹی نذیر احمد صاحبؒ وغیرہم نے بالاتفاق اس لفظ کا ترجمہ قربانی ہی کیا ہے۔[1]

یہ سورۂ کوثر کی آیت ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

ان اعطینک الکوثر۔ فصل لربک وانحر۔ ان شانئک ھو الابتر

اس میں لفظ نحر قابلِ غور ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ روایات سے قرآن کا صحیح صحیح مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ اگر ان سے مدد نہ لی جائے تو قرآن کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ نحر کا لفظ قرآن میں اسی مقام پر استعمال ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ روایات اس کا کیا مفہوم متعین کرتی ہیں۔

---

[1] "ان صلاتی ونسکی" والی آیت میں، شاہ عبدالقادرؒ۔ شاہ رفیع الدینؒ۔ اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے نسکی کا ترجمہ "عبادات" کیا تھا اور چونکہ یہ ترجمہ مودودی صاحب کے منشاء کے خلاف تھا اس لئے مودودی صاحب نے اس مقام پر ان کے ترجموں کا ذکر نہیں فرمایا۔ اب چونکہ اُن کا ترجمہ ان کے منشاء کے موافق ہے اس لئے ان کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

(۱) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نحر سے مراد دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو نماز میں اپنے سینے پر رکھنا ہے۔

(۲) حضرت علیؓ سے دوسری روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبریلؑ سے پوچھا کہ یہ نحیرہ کیا ہے جس کا میرے رب نے حکم دیا ہے۔ جبریلؑ نے کہا نحیرہ نہیں۔ لیکن حکم یہ ہے کہ آپ نماز کی پہلی تکبیر، رکوع، بعد رکوع اور سجود کے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں۔ یہ ہماری نماز ہے اور ملائکہ کی نماز ہے جو سات آسمانوں میں رہتے ہیں۔ ہر ایک چیز کی ایک نیت ہے اور نماز کی نیت ہر تکبیر کے نزدیک رفع یدین کرنا ہے۔

(۳) حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ نحر کے معنی ہیں "اپنی گردن قبلہ کے مقابل کر"

(۴) امام باقرؒ کا ارشاد ہے کہ اس سے مراد نماز کے شروع کے وقت رفع یدین کرنا ہے۔

(۵) حضرت عطا خراسانیؒ فرماتے ہیں کہ وانحر سے مراد یہ ہے کہ اپنی پیٹھ رکوع سے اٹھاؤ تو اعتدال کرو اور سینے کو ظاہر کرو یعنی اطمینان حاصل کرو۔

ان روایات کے علاوہ دیگر اقوال ملاحظہ فرمائیے:۔

(ا) ابن الاعرابیؒ نے کہا ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے۔

(ب) ضحاکؒ کا بیان ہے کہ اس کے معنی ہیں دونوں ہاتھ دعا کے بعد چھاتی کے اوپر کے حصہ تک بلند کر۔

(ج) امام راغبؒ (مفردات) میں لکھتے ہیں کہ نحر چھاتی کے اوپر گلو بند کے مقام کو کہتے ہیں۔ اس لئے وانحر میں حکم ہے ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے شہوت کی بیخ کنی کر کے نفس کشی کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

آپ نے نحر کے لفظ کی تحقیق ملاحظہ فرمائی۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ذبح شتر ہے۔ اس لئے اس کے معنی قربانی ہو گئے۔

فصل لربك وانحر ۔ اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

اب اس آیت کے مقام نزول کے متعلق دیکھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ محمد علی صاحب لاہوری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

> اس سورت کے نزول کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض اسے مکی کہتے ہیں اور بعض مدنی اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ اس کا نزول دو دفعہ ہوا ہے۔ ایک مکہ میں اور ایک مدینہ میں۔ مگر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی![1]

لیکن علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ ارشاد ہے:۔

> یہ سورت صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبہ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے۔

ذرا آگے چل کر پوری کی پوری سورہ (سورۂ کوثر) کی حکمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کا اپنا ذریعۂ علم کیا ہے؟ محض قیاس!

سادہ لفظوں میں گویا یوں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز پڑھنے والی، اور راہ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان امت دی ہے جو بیت الحرام کا حج کرے گی۔

یعنی وانحر سے مراد "بیت الحرام کا حج" کرنا ہے۔

ابن جریرؒ نے اس باب میں لکھا ہے:۔

سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ فصل لربك وانحر والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کر کے لوٹ جاؤ۔ آنحضرتؐ اٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی کی اسوقت حضرت جبریلؑ نے فصل لربك کا پیام دیا۔

یعنی جب کفار مکہ نے حضورؐ کے قافلہ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور قربانی کے جانوروں کو بھی مکہ تک جانے سے روک دیا گیا (جیسا کہ سورۂ فتح میں مذکور ہے) تو سوال یہ پیدا ہوا کہ قربانی کے جانوروں کو کیا کیا جائے۔ اس وقت جبریلؑ آئے اور کہا کہ ان کی یہیں قربانی دے کر دو رکعت نماز پڑھ لیجئے۔

وانحر کے معنی بھی آپ نے دیکھ لئے اور مقام نزول کے متعلق بھی بیانات ملاحظہ کر لئے۔ ذرا غور کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وانحر سے مراد ہے دنیا کے ہر گلی کوچے میں قربانی کے جانور ذبح کرنا! اگر یہ سورت (سورۂ کوثر) مکہ میں نازل ہوئی تھی تو اندازہ یہ ہے کہ یہ ہجرت کے قریب کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے کیونکہ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ جن سورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے ان کا تعلق ہجرت کے واقعہ سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر شدائد و مصائب ہجوم کر کے آ چکی تھیں۔ نظر بظاہر ہر طرف مایوسی دکھائی دیتی تھی۔ وقت وہ آ چکا تھا کہ انہیں اپنے گھر بار کو بھی چھوڑنا تھا۔ مستقبل میں بھی کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان یاس انگیز حالات میں انا اعطیناك الکوثر (یقیناً ہم نے تمہیں اپنے انعامات سے بڑی کثرت سے نوازا ہے) کا مژدۂ درخشندہ بڑا حیات بخش (اور مخالفین کے لئے حیرت انگیز) تھا۔ اس کے لئے ارشاد یہ ہوا کہ یہ کثرتِ نعمت نتیجہ ہوں گی اس نظام کی تشکیل و تنفیذ کا جس کا آغاز صلوٰۃ سے ہوتا ہے اور انتہا حج کے اجتماع سے۔ (فصل لربك وانحر)۔ نحر کے معنی اگر قربانی لئے جائیں تو یہ اونٹ کی قربانی کے لئے مختص ہے۔ "اونٹ کے ذبیحہ" میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا۔ مدینہ میں اس وقت یہودیوں کا غلبہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی کو خیال پیدا ہو جائے کہ اب "کمزور و ناتواں" مسلمانوں کا یہ قافلہ ہجرت کے بعد مدینہ کے یہودیوں سے مفاہمت (Compromise) کر کے قریش مکہ کا مقابلہ کرے[1]۔ وانحر کے لفظ سے اس شبہ کو بھی مٹا دیا۔ یہودیوں کے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معراج انسانیت" عنوان ہجرت۔

ہاں اونٹ حرام تھا۔ مسلمانوں کو اونٹ ذبح کرنے کیلئے کہا گیا یعنی یہود کے علی الرغم۔ یوں سمجھئے جس طرح آج ہندوستان کے شکستہ حال مسلمانوں کو کوئی "اشارۂ غیبی" یہ کہے کہ "اٹھو اور گائے ذبح کرو"۔ اور اگر یہ سورت صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی تو اس وقت بھی حالات سخت نامساعد تھے۔ بظاہر، وہ صلح شکست ہی کے مرادف تھی۔ لیکن قرآن نے عین اس وقت "عطائے کوثر" کا مژدہ حوصلہ افزا سنایا اور واٰنحر[1] سے یہ بتا دیا کہ اگر انہوں نے آج تمہیں مکہ تک پہنچنے سے روک دیا ہے اور تمہاری قربانیوں کو بھی ان کی قربان گاہ (کعبہ) تک نہیں پہنچنے دیا، تو اس کا کیا غم، تم عنقریب وہاں پہنچکر قربانیاں کرو گے۔

ان تصریحات کے بعد آپ سوچئے کہ "فصل لربك وانحر" میں وانحر سے عید کے دن ہر گلی کوچے میں قربانی کا وجوب کس طرح سے ثابت ہوتا ہے؟

لیکن اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ وانحر سے مراد ہر گلی کوچے میں قربانی ہے تو ذرا حسب ذیل امور پر بھی غور کیجئے: "فصل لربك وانحر" میں فصل (نماز پڑھ) امر کا صیغہ ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ نماز فرض ہے۔ اسی طرح وانحر امر کا صیغہ ہے، لہٰذا نحر بھی فرض ہوئی، یعنی جو حیثیت نماز کی ہے وہی حیثیت قربانی کی ہوگی۔ دونوں برابر کی فرض ہوں گی کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ فصل (نماز) کے فرض ہونے کے متعلق تو کسی کو کلام نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ وانحر (قربانی) کے متعلق کیا عقیدہ ہے۔ خود مودودی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر فرماتے ہیں:-

> قرآن و حدیث کے ان دلائل کی بنا پر فقہائے امت نے بقرعید کی قربانی کے متعلق بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ یہ ایک مشروع فعل ہے اور سنن اسلام میں سے ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس میں کہ یہ واجب ہے یا نہیں۔ مگر اس کا مشروع اور سنت ہونا متفق علیہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری میں مذاہب فقہاء کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-
>
> اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ بقرعید کی قربانی شرائع دین میں سے ہے۔ شافعیہ اور جمہور کے نزدیک یہ سنت موکدہ بطریق کفایت اور شافعیوں میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ مقیم اور خوشحال آدمی پر واجب ہے۔ امام مالکؒ کی رائے بھی ایک روایت کی رو سے یہی ہے مگر انہوں نے مقیم کی قید نہیں لگائی۔ اوزاعی اور ربیعہ کی بھی یہی رائے ہے۔ حنفیوں میں سے ابو یوسفؒ اور مالکیوں میں سے اشہب نے جمہور کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ قدرت کے باوجود قربانی نہ کرنا مکروہ ہے۔ اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی

---

[1] نحر کے معنی کسی معاملہ پر پورا پورا اقابو پا لینا بھی ہوتے ہیں۔ نحر الامور کے معنی ہیں اس نے معاملات کو اپنے (Control) میں کر لیا۔ "نحر العلم نحرا" کے معنی ہیں اس نے اپنے آپ کو علم پر (Master) کر لیا۔ اس لئے نعرۂ کثیر حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ نظام صلوٰۃ قائم کیا جائے اور اس طرح تمام امور پر پورا پورا غلبہ و تسلط حاصل کر لیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مخالف قوتیں بیخ و بنیاد سے اکھڑ جائیں گی اور ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ ان شانئك هو الابتر۔

ایک ایسی سنت ہے جسے چھوڑ دینے کی اجازت نہیں۔

ہ نے غور فرمایا کہ عید کی قربانی کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں۔ زیادہ سے زیادہ سنت ہے اور وہ بھی ایسی کہ امام احمدؒ کے نزدیک اگر باوجو یت (استطاعت) کے قربانی نہ کی جائے تو یہ مکروہ ہوگا۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن میں "فصل لربك وانحر" کا حکم آتا ہے۔ صلّ زپڑھو) کے متعلق ہر ایک کا اتفاق ہے کہ یہ فرض عین ہے۔ لیکن اسی حکم کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق یہ کیفیت ہے کہ اسے کوئی بھی ض قرار نہیں دیتا۔ صلوٰۃ کا تارک تو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے لیکن استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرنے والا، مکروہ فعل کا مرتکب دانا جاتا ہے۔ اور بس!! اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ وانحر سے مراد عید کی قربانی لینا کس حد تک قرآنی مفہوم کہلا سکتا ہے۔

پھر ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اگر وانحر سے مراد قربانی ہے تو نحر صرف اونٹ قربانی کے لئے مخصوص ہے۔ گائے، بھیڑ، بکری کی قربانی اس میں قطعاً شامل نہیں۔

ایک قدم اور آگے۔ قرآن نے "فصل لربك وانحر" فرمایا۔ صلّ کے معنی ہوئے "نماز پڑھ" اور وانحر کے ان کے نزدیک قربانی کر۔ اب ظاہر ہے کہ صلّ کے حکم کی ادائیگی اسی شکل میں اور انہی شرائط کے ساتھ ہوگی جو قرآن میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں۔ مثلاً قرآن نے حکم دیدیا کہ صلوٰۃ کے لئے قبلہ کی طرف رخ کرنا چاہئے۔ لہٰذا جب صلّ کہا جائے گا تو اس کے ساتھ یہ تمام شرائط ملتزم ہوں گی جس طرح صلّ کے لئے یہ ضروری ہے اسی طرح وانحر کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ صلّ کے لئے قرآن نے سمتِ قبلہ کا تعین فرما دیا ہے۔ اسی طرح وانحر کے لئے قرآن ہی نے کعبہ کے مقام کی تعیین کر دی ہے۔ لہٰذا جس طرح صلّ (نماز) کے لئے سمتِ قبلہ ضروری ہے اسی طرح نحر (قربانی) کے لئے مقامِ کعبہ ضروری ہے۔ نہ سمتِ قبلہ کے بغیر (ہر طرف رخ کر کے) صلوٰۃ ہو سکتی ہے نہ مقامِ کعبہ کے بغیر (ہر مقام پر) قربانی۔ صلّ (صلوٰۃ) کے متعلق قرآن کی تمام حدود و قیود کا التزام ضروری قرار دینا لیکن وانحر (قربانی) کے متعلق، قرآن کی متعین کردہ شرط کے یکسر خلاف، دنیا کے ہر گلی کوچے کو قربان گاہ تصور کر لینا، تؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (کتاب کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے حصہ سے انکار) کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ جب قرآن میں قربانی کے متعلق ایسی تصریحات موجود ہیں تو پھر وہ کونسی وجہ ہے جس کی بنا پر یہ تمام حضرات اس پر مُصر ہیں کہ قربانی کی جگہ مختص نہیں۔ یہ ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو دین کے دوسرے شعبوں کو قرآن کے خلاف لے جانے کی وجہ بنی ہے۔ یعنی روایات!! کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں مذکور ہے کہ نبی اکرمؐ نے عید قرباں کے دن اپنے طور پر قربانی کی۔ چونکہ ہمارے ہاں "دین" کی بنیاد قرآن نہیں بلکہ احادیث ہیں، اور احادیث، قرآن کی ناسخ بھی ہو سکتی ہیں اور اس پر قاضی بھی، اس لئے جس معاملہ میں قرآن اور احادیث میں اختلاف ہوگا، ان لوگوں کا عمل حدیث کے مطابق ہوگا،

قرآن کے مطابق نہیں۔ قرآن میں تصریح موجود ہے کہ قربانی حج کے موقعہ پر کعبہ میں کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ چند ایک روایات میں آچکا ہے کہ رسول اللہؐ عید کے دن قربانی کیا کرتے تھے اس لئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اسے کہنے دیجئے، عمل حدیث پر ہوگا!

لیکن جیسا کہ روایات میں عام طور پر ہوتا ہے، اس باب میں بھی دونوں قسم کی روایات موجود ہیں۔ ایسی بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی۔ اور ایسی بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ میں قربانی کی یا اپنے قربانی کے جانور مکہ معظمہ میں بھیجے۔ روایت پرست حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ بیان احادیث کو تو بڑھ چڑھ کر پیش کرتے ہیں جن میں عید قربان پر قربانی کا ذکر ہے۔ لیکن ان دوسری قسم کی احادیث کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ علاوہ بریں، حدیث کو حجتِ دین قرار دینے میں ایک بہت بڑا "فائدہ" یہ بھی ہے کہ احادیث کے متناقض ذخیرہ میں سے جو حدیث آپ کے مطلب کی ہو اُسے آپ مستند قرار دیدیجئے اور جو آپ کے خلاف جائے اُسے ضعیف ٹھہرا دیجئے۔ مودودی صاحب نے اپنے لئے اس باب میں اور بھی آسانیاں پیدا کرلی ہیں کیونکہ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیث کو مستند یا ضعیف قرار دینے کا معیار اُس شخص کا فیصلہ ہے جو "مزاج شناسِ رسول اللہؐ" ہو۔[لہ] اسی مسلک کے پیش نظر مودودی صاحب نے اپنے محولہ بالا مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ "اس باب میں جو مستند روایات ہیں ان میں سے چند یہ ہیں" (اس کے بعد کچھ روایات درج فرمائی ہیں)۔ لیکن جہاں اُس قسم کی احادیث ہیں وہاں اِس قسم کی احادیث بھی اُنہی کتابوں میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ قربانی کے جانوروں کو مکہ بھیجا کرتے تھے۔ مثلاً

(۱) بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مالک، نسائی، سب کے سب اس حدیث کے راوی ہیں جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ آپ مدینہ سے ہدیٰ کو مکہ روانہ فرماتے تھے تو آپ کے ہدی کے ہار میں بنایا کرتی تھی۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے حدیبیہ کے سال بہت سے اونٹ بطور ہدیٰ مکہ کو روانہ کئے۔ ان میں ایک اونٹ چاندی کی نتھنی والا بھی تھا۔

(۳) حضرت نافعؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اپنی قربانی کے جانوروں کو قباطی، انماط اور حلل کی جھولیں پہناتے اور کعبہ کی طرف روانہ کردیتے۔ [۵۲]

(۴) زاد المعاد میں علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ اس سال غزوۂ تبوک سے واپسی پر رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو کم و بیش تین سو مسلمانوں کے ہمراہ حج کے لئے بھیجا اور اپنے قربانی کے بیس اونٹ جن کے گلوں میں خود اپنے ہاتھ سے قلادے پہنائے تھے ان کے ساتھ کردیئے۔ دوسرے سال (۱۰ھ میں) حضور اکرمؐ نے خود حج کیا اور مکہ میں سو جانوروں کی قربانی کی۔ الغرض حج کی فرضیت ...

[لہ] ملاحظہ ہو مضمون "مسئلہ متعہ" جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔

[۵۲] اس وقت "تلخیص" ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ان حوالوں کیلئے ہم محترم عرشی صاحب کے مضمون کے شکر گذار ہیں۔

دو سال آپ زندہ رہے اور دونوں سال آپ کی طرف سے قربانی مکہ میں ہوئی۔

روایت پرست حضرات کہتے رہتے ہیں کہ کسی روایت کی صحت اور سقم جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ بہت اچھا! قرآن نے قربانی کے لئے کعبہ کا مقام متعین کر دیا۔ روایات دونوں قسم کی موجود ہیں۔ وہ بھی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود کعبہ میں قربانی کی اور یا اپنی قربانی کے جانور مکہ بھیجے اور وہ بھی جو قرآن کے خلاف یہ بتاتی ہیں کہ حضورؐ نے عید کے موقعہ پر کہیں اور بھی قربانی کی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ جو احادیث قرآن کے مطابق ہیں وہ صحیح ہیں۔ لیکن یہ مولوی صاحبان مُصر ہیں کہ نہیں! جو احادیث قرآن کے خلاف ہیں وہ صحیح ہیں اور انہی کے مطابق وہ قربانی کو ہر گلی کوچہ میں واجب قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے ان حضرات کا مذہب!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

چلئے! ہم یہ بھی مانے لیتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے مکہ کے علاوہ اور جگہ بھی قربانی کی ہے۔ لیکن قرآن کے تعینِ مقام کے پیش نظر، ہم یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ایسا اُس زمانے میں کیا ہوگا جب قرآن نے اس امر کی تعیین نہیں کی ہوگی۔ قرآن کے حکم کے بعد ایسا کبھی نہیں کیا ہوگا کیونکہ رسول اللہ قرآن کی کامل اتباع فرماتے تھے۔ لہٰذا قرآن کی تعیین کے بعد رسول اللہؐ کا وہ عمل جو قرآنی حکم سے پہلے کا ہو، سند نہیں قرار پا سکتا۔ مثلاً رسول اللہؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن کب؟ اسوقت جب ہنوز قرآن نے سمتِ قبلہ کا تعین نہیں کیا تھا۔ جب قرآن نے سمت متعین کر دی تو اس کے بعد رسول اللہ قبلہ کی سمت نماز پڑھنے لگ گئے۔ اب اگر کوئی شخص، ان روایات کی بنا پر جن میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، یہ کہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مسنون ہے کیونکہ ..... رسول اللہؐ سے ایسا ثابت ہے تو کیا آپ اس "سنتِ رسول اللہؐ" پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے؟ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ لیکن سوچئے کہ قربانی کے بارے میں آپ ایسا ہی کر رہے ہیں! جب قرآن نے مقامِ قربانی کا تعین کر دیا تو اس کے بعد رسول اللہؐ کا وہ عمل جس میں آپ نے (اس حکم سے پہلے) دوسرے مقامات پر قربانی کی ہو، سنت رسول اللہؐ قرار نہیں پائیگا!

لیکن اگر آپ اس کے بعد بھی اسی پر مُصر ہیں کہ رسول اللہؐ نے قرآنی تعیین کے بعد بھی، دوسری جگہ قربانی کی ہے، تو معاف فرمائیے! ہم حضورؐ کے متعلق اس قسم کے خیال کی جرأت قطعاً نہیں کر سکتے۔ ہم اسے حضورؐ کے خلاف بہت بڑا افترا سمجھتے ہیں اور افکِ عظیم۔ ایسا ہی افترا جیسے کوئی کہے کہ سمتِ قبلہ کے تعین کے بعد بھی حضورؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کے کسی عمل کو قرآنی تصریحات کے خلاف بتاتی ہے ہمارے نزدیک قطعاً وضعی ہے اور بہتانِ عظیم۔

قربانی کو عام طور پر "سنتِ ابراہیمیؑ" کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ قرآن میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس خواب کو حقیقی سمجھا اور حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ جب انھیں لٹا دیا تو خدا نے آواز دی کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا![1] قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ایک مینڈھا جنت سے بھیجا گیا جس کی قربانی حضرت ابراہیمؑ نے کر دی۔ یہ بیان تورات کا ہے۔ قرآن کا نہیں۔ لہٰذا بکروں کی قربانی سنت ابراہیمیؑ بھی نہیں۔ اگر کسی کو سنتِ ابراہیمیؑ پر عمل پیرا ہونا ہے تو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹائے۔ اس کے بعد اگر اسے خدا کی طرف سے آواز آجائے کہ بیٹے کو چھوڑ دو، تو چھوڑ دے۔ اور اگر ایسی آواز نہ آئے تو اُسے ذبح کر ڈالے! بیٹے کی جگہ بکرا ذبح کر دینا اور اسے قرار دینا سنتِ ابراہیمیؑ کا اتباع! تلاعب بالدین ہے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ خدا نے حضرت اسمٰعیلؑ کو "ذبح عظیم" کے فدیہ میں چھڑا لیا اور وہ "ذبح عظیم" یہی (بکروں اور مینڈھوں کی) قربانیاں ہیں جو ہر سال دی جاتی ہیں۔ یہ عقیدہ بھی خود تراشیدہ ہے۔ اول تو اس منطق پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے (حضرت) اسمٰعیلؑ کو چھری سے ذبح ہونے سے بچا کر "ذبح عظیم" (بہت بڑی قربانی) کیلئے مختص کر لیا۔ اور ہمارے ہاں اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے مقابلہ میں بھیڑوں بکریوں کی قربانی "ذبح عظیم" ہے۔ غور کیجئے کہ اس سے کیسی بلند حقیقت کو کتنی پست سطح پر لایا جاتا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ باپ کے پہلوٹھے بیٹے (اور منصب سرداری کے مستحق) ہونے کی جہت سے شام کی سرسبز و شاداب وادیوں کے حکمران بننے والے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ انھیں، اپنے خیال کے مطابق خدا کی راہ میں ذبح کر رہے تھے۔ چھری گلے تک آپہنچی تھی۔ بس ایک لمحہ میں یہ قربانی ختم ہو جانے والی تھی۔ اللہ نے انھیں چھری سے بچا کر حکم دیا کہ مکہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں "ہمارا گھر" بناؤ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو اس گھر کی پاسبانی کے لئے وقف کر دو۔ آپ غور کیجئے۔ سرزمین شام کی شادابیوں اور شگفتگیوں کی جگہ صحرائے عرب کا مسکن اور منصب سرداری اور حکمرانی کے بجائے عبادت گاہ کی تولیت! یہ تھی وہ بڑی قربانی جس کیلئے حضرت اسمٰعیلؑ کو چھڑا لیا گیا تھا۔ وہ قربانی جسے ایک لمحہ میں ختم نہیں ہو جانا تھا بلکہ ساری عمر ساتھ رہنا تھا۔ یہ ایک ایک سانس کی قربانی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ قربانی تھی۔ مسلسل و متواتر قربانی تھی۔ عمر بھر کی قربانی تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ پشتوں تک کی قربانی تھی۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل کے حصہ میں شوکتِ سلیمانی اور دارائے داؤدی آگیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے حصہ میں صحرائے عرب کی عبادت گاہ کی رکھوالی۔ کہئے! یہ قربانی بڑی تھی یا ایک لمحہ میں رگِ جان کا کٹ جانا! یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جس کے اثرات صدیوں تک تولیت کعبہ کی شکل میں متوارث آگے بڑھتے رہے تا آنکہ، شاخِ اسرائیلی کے بے ثمر ہو جانے کے بعد، یہ شاخِ اسمٰعیلی اس حسن و شادابی کے ساتھ گلبار و ثمر ریز ہوئی کہ اس کی تازگی اور شگفتگی میں قیامت تک فرق نہیں آئیگا۔ یہ تھا ثمرہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد سوم (تاریخ رسالت) عنوان "حضرت ابراہیمؑ"

اس "ذبحِ عظیم" کا جس کے لئے حضرت اسمٰعیلؑ کو خدا نے وقف کرلیا تھا۔ اس حقیقت کے بعد سوچئے کہ "ذبحِ عظیم" سے مراد بھیڑوں بکریوں کی قربانی لینا، قرآنی عظمتوں کو کن پستیوں تک لیجاتا ہے۔

اب آخر میں دیکھئے مودودی صاحب کی وہ دلیل جو اس وقت دی جاتی ہے جب کوئی دلیل نہیں سوجھتی۔ وہ دلیل جس کے متعلق قرآن کریم نے ہر نبی کے واقعات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی جب بھی اللہ کا کوئی رسول آتا اور لوگوں کو وحیٔ خداوندی کی طرف دعوت دیتا تو سامنے سے جواب یہ ملتا کہ ہم اس علم و بصیرت کی اتباع نہیں کریں گے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔ بلکہ

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ۔ (۲۲/۴۳)

ہم نے اپنے اسلاف کو ایک مسلک پر چلتے پایا ہے۔ ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

مترفین قوم یہ کہہ کر عوام کو بھڑکا دیتے اور پھر عوام ان مدعیانِ حق و صداقت کے پیچھے پڑ جاتے۔ یہی سابقہ انبیائے کرامؑ کی وحی کے ساتھ ہوتا رہا اور یہی نبی اکرمؐ کی طرف آمدہ وحی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں:۔

> سب سے بڑا ثبوت اس کے سنت اور مشروع ہونے کا یہ ہے کہ نبیؐ کے عہد مبارک[1] سے لیکر آج تک مسلمانوں کی نسل اس پر عمل کرتی چلی آئی ہے۔ دو چار یا دس پانچ آدمیوں نے نہیں بلکہ ہر پشت کے لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں نے اس طریقہ کو اخذ کیا ہے اور اپنے بعد والی پشت تک کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں تک اسے پہنچایا ہے۔

اس کے بعد مودودی صاحب اُس حربہ پر اتر آتے ہیں جس سے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے۔

> اگر تاریخ اسلام کے کسی مرحلہ پر کسی نے اسے ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ عام مسلمان بالاتفاق رائے اسے قبول کرتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا۔ آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑ دی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہماری پچھلی نسلیں ایسی ہی منافق تھیں تو معاملہ قربانی تک کب محدود رہتا ہے۔ پھر تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بلکہ خود رسالت محمدیہ اور قرآن تک سب ہی کچھ مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

---

[1] نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کے متعلق تو دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے)۔ اس لئے اپنے اس "سلسلہ" میں عہدِ نبوی کو تو شامل نہ کیجئے۔ بعد کا ذکر کیجئے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں بعض لوگ نہ خدا کا خوف رکھتے ہیں، نہ خلق کی شرم، علم اور سمجھ بوجھ کے بغیر جو شخص جس دینی مسئلہ پر چاہتا ہے بے تکلف تیشہ چلا دیتا ہے پھر اسے کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس ضرب سے صرف اسی ایک مسئلہ کی جڑ کٹتی ہے یا ساتھ ہی ساتھ دین کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے۔

یہ ہے وہ آخری دلیل محکم جو سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف سے قربانی کے ثبوت میں پیش ہوئی ہے۔ اس دلیل کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے جو خود خدا نے دیا ہے جب فرمایا کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو دیکھا ہے۔ خواہ انہیں شیطان جلتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف ہی کیوں نہ بلا رہا ہو۔

یا خود مودودی صاحب کے الفاظ میں کہ

جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف ہوگی اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۹)

مودودی صاحب عوام کو بھڑکانے کی خاطر فرماتے ہیں کہ "آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑ دی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے؟"

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک یہ امر محال ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد کوئی ایسی چیز دین میں داخل کر دی گئی ہو جو خدا اور رسول کے احکام کے خلاف ہو اور وہ امت میں اس طرح رائج ہو جائے کہ پھر تمام مسلمان اسی مسلک پر چل پڑیں۔ یہ دلیل (بظاہر) بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا جواب ہم سے نہیں خود مودودی صاحب کی زبان سے سنئے۔ مودودی صاحب نے آج سے کچھ عرصہ پہلے، رسالہ الفرقان (بریلی) کے شاہ ولی اللہ نمبر میں "منصب تجدید کی حقیقت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ بتایا تھا کہ اصلی اسلام کیا تھا اور اسے رسول اللہؐ نے کس طرح متشکل فرمایا۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ اس اصلی اسلام پر کیا گذری اور کس طرح گذری۔ سنئے کہ وہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں (اقتباس طویل ہے لیکن ایسا ناگزیر تھا)۔ آپ لکھتے ہیں:۔

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچا دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما دو ایسے کامل لیڈر اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمام قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداً چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

جاہلیت کا حملہ اگر ایک طرف حکومت اسلامی . . . کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں، اسلئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دیکر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انھوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا، "ملک عضوض" نے اس کی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کی بجائے اس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زور حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو مقابلہ شاید آسان ہوتا، مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو مورد الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جما لیا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اس لئے "السلطان ظل اللہ" کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانے سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء

حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت خالصہ کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہو، اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں، اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی، اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پرزے نکالنے لگا۔ اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔ اسی پر بس نہیں رقص، موسیقی اور تصویرکشی جیسے خالص جاہلی آرٹ بھی از سر نو اُن قوموں میں بار پانے لگے جن کو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا۔

جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ اس کام میں دنیا پرست علمائے نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آ سکتی تھیں۔ انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی، مشرکانہ اعمال کیلئے اسلام کی اصطلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کیلئے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرک جلی کی تعریف میں نہ آ سکیں۔ اس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بیچارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد اور پاک باز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر دیا۔

مودودی صاحب کے بیان کے مطابق، رسول اللہ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد "جاہلیت" اسلام میں گھس آئی اور اس نے

مرض سرطان کی طرح مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے۔ اور اس کے بعد ہو یہ گیا کہ امارت کی مسند اور سیاست کی راہ نمائی پر جاہلیت مسلمان کا نقاب اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ تعلیم کی مسند سے جاہلیت مسلمان کے لباس میں معلم بن کر متمکن ہو گئی اور خانقاہوں کے سجادوں پر جاہلیت مرشد و مربی کے خرقوں سے مسلط ہو گئی۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد زندگی کے عناصر ثلاثہ، سیاست، شریعت اور تصوف، سب پر غیر اسلامی تصورات چھا گئے اور چھا گئے خالص اسلام کا نقاب اوڑھ کر۔

ہم مودودی صاحب سے پوچھتے یہ ہیں کہ جب سرے سے پورے کے پورے اسلام کی جگہ ایک جدید اسلام نے لے لی تھی اور غیر اسلامی معتقدات و اعمال، یکسر اسلامی شعائر و مناسک بن کر مسلمانوں میں مروج ہو گئے تھے۔ تو اس سیلاب جاہلیت میں اگر یہ خیال بھی بہہ کر آ گیا ہو کہ ہر گلی کوچے میں قربانی امر مشروع ہے، تو اس میں کونسی بات وجہ استعجاب ہے!

اصل یہ ہے کہ مودودی صاحب کرتے یہ ہیں (اور یہ مسلک ہر شخص کا ہوتا ہے جو ایک نئی پارٹی (فرقہ) کا مرکز بن رہا ہو) کہ جب انھیں یہ (Suit) کرے کہ مسلمانوں کو گمراہ اور برباطل قرار دیا جائے تو وہ بے محابا ایسا کہتے چلے جائیں گے۔ لیکن اس استثنار کے ساتھ کہ "اس گمراہی و ضلالت کے باوجود، ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے رہتے ہیں جو حق پر ہوتے ہیں" تاکہ اس سے وہ اپنی پارٹی کو برسرِ حق ثابت کر سکیں۔ لیکن جب کوئی دوسرا شخص یہ کہے کہ مسلمانوں میں فلاں بات غلط چلی آ رہی ہے تو وہ جھٹ جمہور کے بہی خواہ بن بیٹھیں گے اور انھیں یہ کہہ کر بھڑکائیں گے کہ "دیکھو! یہ شخص تمہارے اسلاف کے متعلق کہتا ہے کہ وہ سب گمراہ تھے۔ استغفر اللہ۔ توبہ توبہ، ایسی جرأت"۔ مثلاً پچھلے دنوں مودودی صاحب نے ایک اصول بیان فرمایا تھا کہ جو شخص کسی منصب کیلئے امیدوار ہو اسے اس منصب سے محروم کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسی منصب کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنا قرآن اور حدیث دونوں کے خلاف ہے۔ اس پر کسی صاحب نے اعتراض کیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کیلئے خود بطور امیدوار پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ

> آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسولؐ سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہو گا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

اگر یہی چیز کہیں طلوع اسلام میں شائع ہو جاتی تو آپ دیکھتے کہ اس پر کس طرح سب و شتم کی بوچھار ہوتی اور جمہور کو کس طرح یہ کہہ کر ابھارا جاتا کہ دیکھو! اب، اور تو اور، حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی پر بھی حملے ہونے لگ گئے ہیں!

بہرحال آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مودودی صاحب نے اپنے اس اعتراض کا جواب کہ امت میں اس قسم کا خلاف اسلام مسلک کیسے رائج ہو سکتا تھا، خود ہی کس طرح دیدیا ہے۔ مودودی صاحب نے یہ تو بتا دیا کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد کس طرح پورے کا پورا اسلام ایک دوسری قسم کے اسلام سے بدلا گیا۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ جاہلیت، جو اسلام کا نقاب اوڑھ کر اندر گھسی تھی، آئی کن کن راہوں سے تھی اور اس کا طریق کار کیا تھا؟ مودودی صاحب کیلئے یہ بتانا مشکل تھا۔ مجرد گفتگو (Abstract talk) میں انسان کے لئے بڑی گنجائش رہتی ہے لیکن متعین گفتگو (Definite talk) میں آپ کو ٹھوکر سامنے آنا پڑتا ہے۔ مودودی صاحب جانتے ہیں کہ "جاہلی اسلام" نے یہ سب کچھ روایات کی آڑ میں کیا۔ طلوع اسلام اس کو وہ سازش قرار دیتا ہے جس کا ذکر اس کے صفحات پر بار بار ہوتا چلا آرہا ہے اور اس طرح مسلمانوں کے دامن کو روایات کی جھاڑیوں سے چھڑانا چاہتا ہے۔ مودودی صاحب بھی روایات کو ویسا ہی غیر یقینی مانتے ہیں جیسا طلوع اسلام۔ روایات کے متعلق اُن کے یہ خیالات اس سے قبل انہی صفحات پر پیش کئے جا چکے ہیں جن میں وہ کہتے ہیں۔

(۱) صداقت کے ساتھ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب ملی جلی تھیں۔

(۲) یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔

(۳) محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ . . . نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض عقلی نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔

(۴) وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔

(۵) یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

(۶) حقیقت یہ ہے کہ روایات کے لحاظ سے نقد حدیث کے جسقدر ذرائع ہمارے پاس ہیں وہ مفید علم و یقین نہیں ہیں بلکہ ظن غالب ہی تک ہمیں پہنچاتے ہیں۔ [1]

لیکن اس کے بعد طلوع اسلام تو کھلے کھلے کہدے گا کہ حق (قرآن) کی موجودگی میں ظن و تخمین (روایات) دین میں حجت نہیں قرار دی

---

[1] پہلے اقتباسات تفہیمات حصہ اول سے ہیں اور آخری اقتباس رسالہ ترجمان القرآن بابت مارچ، اپریل، مئی ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۴۶ کے حاشیہ سے لیا گیا ہے۔

جا سکتیں۔ لیکن مودودی صاحب ایسا نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ ایسا کہنے سے وہ بھی "منکرِ حدیث" قرار پا جائیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ منکرِ حدیث کبھی اسلامی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا نہ ہی عوام میں مقبول رہ سکتا ہے۔ وہ روایات کو غیر یقینی قرار دے کر ماڈرن طبقہ کے نزدیک ماڈرن بن جائیں گے اور اپنی تحریروں میں "کتاب وسنت" کے الفاظ دہرا دہرا کر عوام میں حامیٔ سنت رسول اللہ قرار پائیں گے۔

اس کے علاوہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، احادیث کو دین قرار دینے میں گنجائش بڑی نکل آتی ہے۔ حدیثوں کے مجموعہ میں ہر قسم کی روایات مل جاتی ہیں۔ جس حدیث کو آپ اپنے مطلب کے مطابق سمجھیں اسے "مستند" کہدیں۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے ضعیف قرار دیدیں! آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ ماہ قبل یہ بحث چلی تھی کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت جائز ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے ایسی احادیث پیش کیں جن سے مترشح ہوتا تھا کہ زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں اور زمین بٹائی پر نہیں دی جا سکتی۔ مودودی صاحب زمین پر زمینداروں کی ملکیت رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کہدیا کہ جو احادیث بٹائی کو ناجائز قرار دیتی ہیں سب غیر مستند ہیں اور جو احادیث بٹائی کے حق میں پیش کر رہا ہوں بالکل ثقہ اور صحیح ہیں۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے اسے بغور دیکھئے۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائیگی کہ

(i) قرآن کریم نے قربانی کا ذکر حج کے سلسلہ میں کیا ہے۔

(ii) ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات پر اس کی تخصیص اور تعیین کر دی ہے کہ قربانیوں کا مقام خانہ کعبہ ہے۔

(iii) قربانی کے متعلق واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اس سے مقصود سامانِ خورونوش کا مہیا کرنا ہے۔

(iv) قرآن میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ عید کے دن، اپنی اپنی جگہ، ہر گلی کوچے میں قربانیاں دینے کا حکم ہے۔

اس سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(a) قربانی حج کی تقریب پر کرنی چاہئے اور وہ بھی صرف اسی قدر جس سے خورونوش کا سامان ہو جائے۔ لہٰذا

(b) نہ تو حج میں ایسی قربانیوں کی اجازت ہے جنھیں زمین میں دبا دیا جائے اور نہ ہی حج سے باہر قربانی کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے قرآن کی کھلی کھلی اور واضح تعلیم۔ باقی رہیں احادیث۔ سو

(i) ان میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ وہ بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی۔ اور وہ بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ معظمہ میں بتقریب حج قربانی کی یا قربانی کے جانوروں کو مکہ معظمہ بھیجا۔

(ii) لہٰذا قرآن کی تخصیص و تعیینِ مقام و تقریب کے بعد، اول قسم کی احادیث کے متعلق یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ

(a) یا تو اس زمانے سے متعلق ہیں جب قرآن میں ہنوز حج کی قربانی کے احکام نہیں آئے تھے۔ اس لئے جب وہ احکام آگئے تو

رسول اللہؐ کا یہ عمل سند نہ رہا۔ اور

(ب) اگر شق (ا) ناقابل تسلیم ہو تو پھر لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ یہ روایات وضعی ہیں کیونکہ رسول اللہؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

لیکن اگر اس کے باوجود آپ کو اس پر اصرار ہے کہ حج میں ہر حاجی کو ایک ایک، دو دو، چار چار، دس دس، سو سو جانور ذبح کرنے کی اجازت ہے اور ہر جانور کے ذبح کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ اور نیز یہ کہ دنیا کے ہر گلی کوچے میں عید کے دن جانور ذبح کرنا امر مشروع ہے۔ تو ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کام راستہ دکھا دینا ہے۔ راستے پر لگا دینا نہیں۔

مشکل یہ ہے کہ جب انسان کے ذہن میں کوئی بات اندھی تقلید کی بنا پر بطور عقیدہ جم جائے تو اس میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر ان حضرات میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو ہم ان سے کہتے کہ آپ ذرا تصور میں لائیے کہ کسی جگہ قریب ایک لاکھ انسان جمع ہوں اور ان میں سے ہر ایک دو دو۔ چار چار بھیڑوں بکریوں کو ذبح کر کے زمین پر تڑپتا چھوڑ دے اور اس کے بعد ان تمام تین چار لاکھ لاشوں کو گڑھے کھود کھود کر دبا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا میں ہر مقام پر کروڑوں کی تعداد میں اسی طرح جانور ذبح کئے جائیں اور دن بھر ان جانوروں کا گوشت اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومتا پھرے۔ اور اس کے بعد یہ قوم اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے ایک بہت بڑا کارنمایاں سرانجام دیدیا جس کا انھیں خدا کے ہاں بہت بڑا اجر ملے گا اور یہ جانور انھیں جہنم سے پار لگانے کا موجب بنیں گے۔ یہ منظر تصور میں لائیے اور پھر سوچئے کہ ان چار روایتوں نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ روایات نے کیا یہ ہے کہ اسلام جیسے زندگی بخش نظامِ حیات کو رسومات کا مجموعہ بنا دیا ہے (اور یہی ان لوگوں کا مقصود تھا جنھوں نے مسلمانوں کو قرآن سے ہٹا کر روایات میں الجھا دیا) رسومات سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہیں پرکھتا بلکہ انہی کو بجائے خویش مقصود قرار دے لیتا ہے۔ ان کے برعکس دین (نظامِ زندگی) میں ہر عمل ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اس لئے اسے ہمیشہ نتائج کے لحاظ سے پرکھا جاتا ہے۔ چونکہ رسومات غور و فکر کے معیار پر کبھی پوری نہیں اترتیں اس لئے ان کے ساتھ ہی یہ عقیدہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ دین کو رسومات میں بدلنے کیلئے شروع میں ضرور کاوش کرنی پڑتی ہے لیکن جب ایک دو نسلوں تک یہ سلسلہ چل جائے تو اس کے بعد سابقہ نسل کا عمل (اسلاف کا مسلک) آنے والی نسل کیلئے سند قرار پا جاتا ہے اور اس طرح یہ گاڑی خود اپنے زور (Momentum) سے خود بخود آگے بڑھتی جاتی ہے اور جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے، اسلاف کے مسلک کی سند پختہ سے پختہ تر ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح نسلاً بعد نسلٍ اسلاف کی تعداد میں بھی تو اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے حتیٰ زرتم المقابر۔ قوم زندگی کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ ہم اسی (Momentum) کے زور میں بہے چلے جا رہے ہیں، ورنہ اگر کسی وقت بھی، تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہو کر سوچ لیا جائے تو بات کچھ ایسی مشکل نہیں جو سمجھ میں نہ آسکے۔ رسول اللہؐ

کا عہد ہمایوں نہایت مختصر سا عرصہ تھا۔ اس وقت یہی دین تھا اور یہی اس کے احکام، جن کے ہم آج مدعی ہیں۔ اس نے جو نتائج پیدا کر دیئے وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ اس کے بعد تیرہ سو برس سے مسلمانوں میں یہ تمام "اعمال" (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کلمہ وغیرہ) مسلسل چلے آ رہے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس عہد کے بعد ان اعمال و معتقدات نے کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کئے جو اس عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس کے بعد ان "اعمال" کو کیا ہو گیا کہ انھوں نے پھل دینا ہی بند کر دیا؟ اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ

(۱) اسوقت خود رسول اللہؐ موجود تھے اور ان کی وجہ سے ان اعمال نے ایسے ثمرات مرتب کر دیئے۔

(۲) وہ دور صحابہؓ کا تھا۔ اس کے بعد ویسے مسلمان کہاں سے آئیں؟

ذرا سوچئے کہ یہ دلائل کس قدر خود فریبی کا موجب ہیں۔ اگر ان اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے خود رسول کی موجودگی ضروری تھی تو پھر سلسلۂ نبوت ختم کیوں کر دیا گیا؟ میرزائی، نبوتِ میرزا صاحب کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ لیکن قرآن اس دلیل کی صاف تردید کرتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ وما محمدٌ الا رسول۔ محمدؐ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ قد خلت من قبلہ الرسل۔ اس سے پہلے بہت سے پیغامبر ہو گذرے ہیں۔ افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم (۳/۱۴۴) اگر یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اس کے بعد اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے پیش کردہ نظامِ حیات کے نتیجہ خیز اور ثمر بار ہونے کیلئے رسول کی موجودگی ضروری نہیں۔ نبوت کو ختم کر کے، قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اب پیغام، نبی کے بغیر، وہی نتائج پیدا کریگا جو اس نے نبی کی موجودگی میں پیدا کئے تھے۔ باقی رہی دوسری دلیل۔ سو وہ پہلی دلیل سے بھی زیادہ رکیک ہے۔ صحابہؓ کو صحابہؓ، نظامِ قرآن پر عمل پیرا ہونے نے بنا دیا تھا۔ اس لئے نظامِ قرآنی جو نتائج اُس وقت پیدا کر سکتا تھا وہی نتائج ہر زمانہ میں مرتب کر سکتا ہے۔ اس نظام کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ مکان اور زمان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں وہی زندگی بخش نتائج پیدا کر دے جو اس نے ایک دفعہ پیدا کئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دلائل، روایت پرستوں نے فریبِ دہی کے لئے وضع کئے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ اب رسول اللہؐ کے عہدِ مبارک کی سی شوکت و عظمت کیوں حاصل نہیں ہوتی تو وہ پوچھنے والوں کو یہ کہکر جھوٹا اطمینان دلا دیتے کہ تم اپنا مقابلہ اُس دور سے کیسے کر سکتے ہو؟ کیا تم اپنے آپ کو صحابہؓ جیسا سمجھتے ہو؟ حالانکہ ہوا یہ تھا کہ صحابہؓ کے زمانہ میں ہر عمل، اس کے نتائج سے پہچانا جاتا تھا اور اب روایت پرستی نے دین کو رسومات میں تبدیل کر کے یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب کے یہ ارکان، مقصود بالذات ہیں۔ تم جب ان رسومات کو ادا کر دیتے ہو تو یہ اللہ کے ہاں مقبول ہو جاتے ہیں اور ان کا "ثواب" تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے جو قیامت کے دن میزان میں تلے گا۔ اس سے ہر شخص مطمئن ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اب بھی یہ حالت ہے کہ جو شخص حج کر کے آتا ہے اُسے پورا اطمینان ہوتا ہے کہ بحمداللہ

میں ایک اہم فریضہ سے سبکدوش ہوگیا۔ اور جو شخص قربانی دیدیتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے اپنی نجات کا سامان مہیا کرلیا۔ قربانی کے مقبول ہونے کے لئے بس اتنی شرط ہے کہ جانور کان کٹا اور دم بریدہ نہ ہو۔ اگر اس کے کان اور دم ثابت ہیں اور وہ کانا اور لنگڑا نہیں ہے تو بس قربانی کا فریضہ مع جملہ شرائط کے ادا ہوگیا۔ دین کے متعلق یہ تصور پیدا کر دیجئے اور اس کے بعد صحابہؓ تو ایک طرف فرشتوں کو بھی لے آیئے۔ دین کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرے گا! دنیا کے باقی مذاہب کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اور اسی تصور کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن عجم کی اُس سازش نے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ (اور جسے مودودی صاحب نے "جاہلی اسلام" سے تعبیر کیا ہے) اسلام کو بھی دیگر مذاہب کی صف میں لا کھڑا کیا اور اس کے زندہ نظامِ حیات کو، جو اُمّتِ وسطیٰ کے لئے امامتِ اقوام (Leader Ship of Nations) کا ضامن تھا، مجموعۂ رسومات بنا دیا۔ اور یہ سب کچھ کیا گیا روایات کے زور پر۔ رسول اللہؐ نے جس طرح اپنی صداقت کی ایک دلیل محکم پیش کی تھی اور وہ یہ کہ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون (۱۰/۱۶) "میں نے اس سے قبل تمہارے اندر اپنی عمر گذاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا"۔ اسی طرح حضورؐ نے اپنے دین کی صداقت کے لئے بھی ایک ہی دلیل پیش کی تھی اور وہ یہ کہ

> قل یٰقوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل۔ فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار۔ انہ لا یفلح الظالمون (۶/۱۳۵)
>
> ان سے کہو کہ اے میری قوم! (اس بات کا فیصلہ کہ تم جس نہج پر زندگی بسر کر رہے ہو وہ کامیابی کی راہ ہے یا جس مسلک کی طرف میں دعوت دیتا ہوں وہ خوشگواریوں کا راستہ ہے، بالکل آسان ہے۔ اس میں کسی بحث وجدل کی ضرورت ہی نہیں) تم اپنے نظامِ زندگی کے مطابق کام کئے جاؤ۔ اور میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کیلئے ہے؟ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ خدا کے نظام کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چلنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کی صداقت کا معیار کیا تھا؟ یہ معیار تھا اس کے نظامِ حیات کے نتائج جو کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ کر دینے کیلئے کافی تھے۔ وہ نتائج جو جلدی سامنے آ جانے والے تھے۔ صرف قیامت کے دن نہیں بلکہ یہیں۔ اسی دنیا میں۔ تھوڑے سے وقت کے بعد۔ یہ تھا دین کا وہ استنتاجی معیار (Pragmatic test) جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان کسی قوم کے مقابلہ میں بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تم اپنے طریق کے مطابق کام کئے جاؤ، ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں۔ قربانیاں دیتے ہیں۔ اس کے بعد نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کامیابی کس کے ہاتھ میں رہتی ہے؟ ہماری ہزار برس کی نمازوں اور روزوں نے کیا نتائج پیدا کر دیئے ہیں جواب پیدا ہو جائیں گے۔ یہ سب اس لئے کہ ہم نے روایات کی رو سے اعمال کو رسومات میں بدل دیا ہے اور اب جب ان رسومات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو روایات ہمیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی ہیں کہ یہ اعمال رائیگاں نہیں جا رہے۔

ان کا نتیجہ قیامت میں نکلے گا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی یہی صوم وصلوٰۃ اور حج اور زکوٰۃ دین کے ارکان تھے۔ لیکن رسول اللہ کا چیلنج یہ تھا کہ ان اعمال کے نتائج ابھی سامنے آئے جاتے ہیں۔ اور وہ نتائج سامنے آگئے لیکن جب ہماری رسومات کوئی نتائج پیدا نہیں کرتیں تو ہم یہ کہہ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ نہیں! ان کے نتائج اگلی دنیا میں جاکر مرتب ہوں گے! کتنا بڑا ہے یہ فریب جس میں امت مبتلا چلی آرہی ہے۔ اس فریب کی رو سے، اعمال کے نتائج اس دنیا میں نہیں، صرف اگلی دنیا میں جاکر مرتب ہوں گے۔ ان نتائج سے مفہوم یہ ہے کہ نجات کس طرح سے ہوگی؟ اس نجات کیلئے روایات نے بہت سی آسان راہیں بتادیں۔ اس کیلئے کسی جدوجہد، کسی سعی وعمل، کسی تگ وتاز، کسی کدوکاوش کی ضرورت نہیں۔ مطلب گناہوں کی معافی سے ہے تاکہ جنت مل جائے۔ سو اس کے لئے بڑے سے بڑے سہل نسخے کتب روایات میں موجود ہیں۔ موطا امام مالکؒ میں ہے کہ

من قال سبحان اللہ وبحمدہ فی یوم مائۃ مرۃ حطت منہ خطایاہ وان کانت مثل زبدۃ البحر۔

جس نے دن میں سو مرتبہ "سبحان اللہ وبحمدہ" کا ورد کر لیا اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے خواہ وہ سمندر کے جھاگ جتنے بھی کیوں نہ ہوں۔

اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ روایات نے تو جنت کو یہاں تک سستا کر دیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ۔[1] جس نے لا الہ الا اللہ کہدیا جنت میں داخل ہوگیا۔ اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین۔ (۳/۱۴۲)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم لوگوں میں سے انھیں پرکھا ہی نہیں جو جہاد کرنے والے ہیں اور مشکلات میں ثابت قدم رہنے والے۔

---

[1] یہ حدیث بڑی دلچسپ ہے سنئے۔

ایک مرتبہ حضورؐ ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس حضرت ابوہریرہؓ جا پہنچے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ جاؤ جو شخص ملے اسے یہ بشارت دیدو کہ جس نے کہدیا لا الہ الا اللہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ وہاں سے واپس آئے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے ملے اور انھیں وہ بشارت سنائی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو زور سے تھپڑ رسید کیا۔ حضرت ابوہریرہؓ بھاگے بھاگے رسول اللہؐ کے پاس پہنچے۔ حضرت عمرؓ بھی پیچھے پیچھے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ تھپڑ کی ضرب سے رو رہے تھے۔ حضورؐ نے واقعہ پوچھا اور پھر حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اسے کیوں پیٹا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا حضورؐ نے کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں مبادا لوگ سست ہو جائیں۔ انھیں کام کرنے دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا۔ ہم لوگوں کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

(مسلم)

فرمایئے اک روایات کی جنت کو چھوڑ کر قرآن کی جنت کی طرف کون آئیگا! قرآن نے حج کے متعلق کہا تھا کہ یہ دنیا میں قیاماً للناس کا موجب ہے۔ یعنی اس سے نوع انسانی میں توازن قائم ہو جائے گا اور انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ حج کا اجتماع اس مقصد کیلئے ہے کہ یہ امت، جس کا منصب شھداء علی الناس (تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی) ہے، ایک مرکزی مقام پر جمع ہو کر سوچے کہ دنیا میں قوانینِ خداوندی کا نفاذ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قیامِ انسانیت، قوانینِ خداوندی کے بغیر ناممکن ہے۔ اسے سوچے اور اس کے بعد وہ تدابیر اختیار کرے جس سے دنیا میں نظامِ خداوندی عملاً نافذ ہو سکے۔ یہ تھا قرآنی حج۔ اسی اجتماع کے خورد و نوش کے لئے قربانی کے جانوروں کی ضرورت تھی۔ لیکن روایات نے یہ کہدیا کہ اگر فلاں فلاں رسومات ادا کر دی جائیں تو حج ہو جاتا ہے اور فلاں فلاں انداز کا جانور ذبح کر دیا جائے تو قربانی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہی حج جسے وجۂ قیامِ انسانیت بننا تھا، یکسر پاترا بن کر رہ گیا۔ یہ ہے جو کچھ روایات نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ اگر ہم قرآن ہی کو دین سمجھتے تو جب تک ہمارے اعمال وہ نتائج مرتب نہ کرتے جنہیں قرآن نے ان کا فطری ثمر قرار دیا ہے، ہم کبھی اطمینان سے نہ بیٹھتے۔ لیکن جب ہم نے روایات کو دین بنا لیا تو پھر نتائج کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ پھر محض رسومات کی پابندی رہ گئی۔ اب آپ قربانی کے ہزار فلسفے تراشتے رہئے، اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان اعمال سے اسی وقت نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جب آپ قرآن سے پوچھیں کہ انہیں کن نتائج کے لئے متعین کیا گیا تھا۔

یہ ہیں قرآن کی رُو سے قربانی کے احکام۔ یعنی

(۱) قربانی اجتماعِ حج کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا مقصد اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے خوراک بہم پہنچانا ہے۔

لہذا اس ضرورت سے زیادہ جس قدر جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ اہلاکِ نسل ہے۔ جسے قرآن نے فساد سے تعبیر کیا ہے۔

(ویھلک الحرث والنسل ۲:۲۰۵)

(۲) حج کے علاوہ قربانی اور کہیں نہیں۔ لہذا یہ جو دنیا کے ہر قریہ اور ہر بستی کے ہر گلی کوچے میں جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کی رُو سے اس کی شرعی حیثیت کچھ نہیں۔

ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون۔

جن حضرات کو اللہ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہے اور وہ قرآن کو ضابطۂ ہدایت مانتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ انہیں حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوگی۔ لیکن جو لوگ ابھی تک اُس سازش کے شکار چلے آتے ہیں، اور اس دامِ فریب سے نکلنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، ان کے لئے اسقدر صراحت اور وضاحت بھی کچھ نفع رساں نہیں ہو سکتی۔ انھیں ان کا مولوی ایک ہی خطبہ میں

بتادے گا کہ یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جو تمہیں "اتباعِ رسول اللہؐ" سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس عجمی سازش کو "اتباعِ رسول اللہؐ" کے نقاب میں پیش کرے گا اور پھر حجاز کے میدان میں لاکھوں بھیڑیں بکریاں ذبح کر کے چھوڑی جائیں گی اور پھر مسلمانوں کی تمام بستیوں میں، ہر گلی اور کوچہ میں جانور ذبح کر کے، ان کے ایک ایک بال کے عوض دس دس نیکیاں حاصل کی جائیں گی اور اس طرح "پلصراط" سے "صحیح وسالم" گذرنے کا ذریعہ فراہم کیا جائے گا۔ اس جاہلیت کی پیدا کردہ سازش کا مقابلہ آسان نہیں۔ اس لئے کہ

> سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آتی۔ بلکہ "مسلمان" بن کر آتی ہے۔ کھلے دشمن، مشرکین یا کفار سامنے ہوں تو مقابلہ آسان ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل، قرآن وحدیث سے استشہاد ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مسلمان مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور اللہ آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے (مودودی صاحب)

طلوع اسلام کا مقصد اسی "مرکب جاہلیت" سے جنگ کرنا ہے۔ وہ مقابلہ کی سختی سے آگاہ اور ان ساحرین کی شعبدہ بازیوں کے اثرات سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن، بایں ہمہ۔

اے کیا غم کہ اس کی آستیں میں ہے یدِ بیضا؟

حضرت علامہ اقبالؒ کی زندہ جاوید کتاب

پیامِ مشرق

کا ولولہ انگیز رقص آور عربی (منظوم) ترجمہ از

ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک (سفیرِ مصر متعینہ پاکستان)

اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر ٹائپ میں چھپا ہوا۔ قیمت مجلد ۷/۸/- روپے

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

(طلوع اسلام کا تبصرہ "نقد ونظر" میں ملاحظہ فرمائیے۔)

لیلۃ القدر — عید — اور عید کا پیغام

[پہلی دو تقریریں محترم پرویز صاحب کی ہیں اور تیسری علامہ اسلم جیراجپوری کی جو تشکیل پاکستان سے بہت پہلے (۱۹۴۰ء میں) صنمکدۂ ہند کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئیں۔ قارئین طلوعِ اسلام ان تقریروں کو دیکھیں اور پھر اُن تقریروں پر غور کریں جو ان تقریبات پر آجکل پاکستان ریڈیو اسٹیشن سے بالعموم شائع ہوتی ہیں۔ وہ ہمارا غلامی کا زمانہ تھا اب ہم آزاد ہیں۔ اُسوقت ہم مجبور تھے، آج صاحبِ اختیار ہیں۔ وہاں ریڈیو پر انگریز اور ہندو کا قبضہ تھا۔ آج بحمد اللہ ہمارے پاس ہمارا اپنا ریڈیو اسٹیشن ہے! دیکھئے کہ وہاں سے کیا نشر ہوا کرتا تھا اور اب یہاں سے کیا نشر ہوتا ہے! سوچئے اور اسکے بعد آئینہ پاس ہو تو اس میں اپنی صورت دیکھئے — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔
طلوعِ اسلام]

(۱) لیلۃ القدر

دنیا کی کسی قوم کو لیجئے۔ سال میں کچھ دن ایسے آئیں گے جن میں وہ جشن و مسرت کے تیوہار منائے گی۔ جب دنیا میں مسلمان آئے تو ان کے ذمے عدل و انصاف کے پھیلانے اور جور و استبداد کے مٹانے کیلئے ایسے اہم فرائض عائد کئے گئے کہ انھیں فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اس قسم کے مسرت و شادمانی کے جشن منائیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی داستانِ زندگی میں بعض واقعات ایسے تھے جن کی یاد قائم رکھنا اقوامِ عالم کی موت و حیات کے اصولوں کی یاد تازہ کرتا تھا، یہ اِس ملت کے تیوہار ہیں۔ اور ان تیوہاروں میں سب سے نورانی وہ جس کا مطلع ہلالِ رمضان اور مقطع روزِ عید ہے۔ جس عظیم الشان واقعہ کی یاد میں یہ تیوہار منایا جاتا ہے اس کی عظمت و رفعت خود بتا دے گی کہ اس تیوہار کو کتنا اہم ہونا چاہیئے۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کیلئے مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں اپنے رسول بھیجے جو لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ لیکن خدا کے یہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکے۔ کہیں یہ زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں مٹ گئے۔ اور کہیں خود انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی صورت مسخ کر دی۔ اب ذرا تصور میں لائیے ایسے منظر کو کہ نگاہیں ذوقِ نظارہ کے لئے بیتاب ہوں لیکن دنیا سے روشنی گم ہو جائے۔ زندگی کا مدار صاف ہوا پر ہو، لیکن فضا مہلک جراثیم سے بھرپور ہو جائے۔ جانِ ناتواں پیاس کی شدت سے پھڑک رہی ہو، لیکن پانی کے ہر چشمے میں زہر مل چکا ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر یکایک سورج بے نقاب ہو کر سامنے آجائے۔ اِس مہلک فضا کی جگہ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے نزہت و لطافت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے ایک نئی زندگی کا سامان پیدا کر دیں۔ اُن زہر سے بھرے ہوئے چشموں کی جگہ ایک جوئے رواں مچلتی، لوٹتی، مسکراتی دامنِ کہسار سے تازہ ولولوں کی بشارتیں لئے بڑھتی چلی آئے۔ تو فرمایئے کیا یہ واقعہ ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی یاد اسوقت تک قائم رکھی جائے جب تک دنیا میں زندگی کے قیام و بقا کے لئے نفیس روشنی، لطیف ہوا اور صاف پانی کی ضرورت ہے؟ یہ آفتابِ جہانتاب، یہ نسیمِ حیات پرور، یہ کوثر و تسنیم کی جوئے رواں ہمارے اللہ کا وہ پیغامِ ازلی ہے جو قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو اس وقت ملا جب حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر مُردنی چھا چکی تھی اور

زندگی کی تاریک رات میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اسلئے مسلمانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر جشن و مسرت کی تقریب اور کوئی نہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۱۰/۵۷)

اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے۔ (ایک ایسا زندگی عطا کرنے والا پیغام) آگیا (جو سرتاپا) نصیحت ہے دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا۔ اور ہدایت و رحمت ہے ان کیلئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اے رسول تم ان سے کہدو کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس کی رحمت۔ پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں (یہ قدرت کا عطیہ) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جسے یہ لوگ دنیا میں جمع کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ نورِ مبین جس سے رمضان کے مہینے میں چشمِ انسانیت نے بینائی حاصل کی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۝ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کا نزول ہوا وہ قرآن جو انسان کے لئے راہ نما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔

اور اسی پاک مہینے میں وہ مبارک رات ہے جس میں نورِ خداوندی کی پہلی جھلک سے دنیا کی نگاہیں آشنا ہوئیں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (۹۷/۱-۵)

ہم نے اس کتاب مبین کو عظمتوں والی رات میں نازل کیا ہے۔ تم کیا جانو کہ یہ عظمتوں والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو اپنی قدر و قیمت میں ہزار مہینوں سے افضل ہے جس رات میں فرشتے اور جبریلِ امین اپنے رب کے فرمان کے بموجب امن و سلامتی کی جنت اپنے آغوش میں لئے دنیا پر نازل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیا نورِ سحر سے جگمگا اٹھتی ہے۔

اس مقدس رات میں اللہ تعالیٰ کے اُس ضابطۂ قوانین کا نزول شروع ہوا۔ جس کا ایک ایک لفظ سرتاپا حق و یقین ہے وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ (۶۹/۵۱) جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں۔ لَا رَيْبَ فِيهِ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ (۴۱/۴۲) حق کہتے ہی اسے ہیں جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو۔ حقیقت کے معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اور اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں علم و دانش ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص ملک خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کیلئے نہیں۔ بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئینِ حیات ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت

مکانی حدود سے بلند ہے۔ اسی طرح زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں، زمانہ در زمانہ ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ اس کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں۔ اس کی (Latent Properties) زمانے کی عقل و علم تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں۔ گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں، آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں ابتدائی زمانے میں بھی یہ خصوصیتیں پانی کے اندر موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ ہیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں۔ اس فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج اس میں ایتھر کی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا اسی خلا میں لپٹا ہوا اس انتظار میں تھا کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتے ہوتے اس کو آن چھوئے اور یہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دے۔ یہی کیفیت مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جس سطح تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے قرآن کریم اس سے بھی آگے نظر آئے گا کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ضابطۂ قوانین ہے۔ مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر ہدایت کے اصول موجود نہ ہوں۔ ایسے اصول جو سب سے محکم اور سیدھی راہ دکھانے والے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل)

بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ متوازن راہ ہے۔

یہی وہ توازن بدوش راہ تھی جس پر چل کر ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی بادیہ نشین قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیائے جہانداری و جہانبانی میں حُسن و اخلاق کے اس مقام تک پہنچ گئی جس کی یاد آج تک دلوں سے محو نہیں ہوئی۔

آج بھی ہم مسلمانوں کے پاس وہی قرآن موجود ہے، اور آج بھی اس کی ویسی ہی تلاوت ہوتی ہے۔ اسی رمضان شریف میں دیکھئے لاکھوں مرتبہ اسے دہرایا گیا ہوگا۔ پھر کیا ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت عام طور پر ویسی نہیں ہے جیسی پہلے مسلمانوں کی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ قرآن کریم قوانین کا مجموعہ ہے اور قوانین ہمیشہ عمل کرنے کے لئے ہوتے ہیں، محض پڑھنے کیلئے نہیں ہوتے۔ پڑھا انہیں اس لئے جاتا ہے کہ

اُن پر عمل کیا جائے۔ جب سے یہ لم نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہم مسلمانوں کی یہ حالت ہوگئی کہ قدم چلتے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آتی، کام ہو رہے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، خود اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے:۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)

اور جو شخص ہمارے قرآن سے روگردانی کریگا تو اس پر روزی تنگ ہو جائیگی۔ اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے۔

آج دنیا دل کے اضطراب اور روح کی پریشانی کے جس جہنم سے گذر رہی ہے۔ ضرورت تھی کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی زندہ و پائندہ کتاب کا وارث بنایا تھا وہ انسانیت کو اس پریشانی اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتاتی۔ لیکن دوسروں کو جگانے والے جب خود ہی سو جائیں تو مخلوق کی حفاظت کس طرح ہو۔ راستہ دکھانے والا جب چراغ ہدایت کو دامن میں چھپالے تو منزل تک کیسے پہنچا جائے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ہمارے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر خود ہی روشنی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہی ہے۔ اس لئے روشنی کے علمبردار زمانے کے ہاتھوں مجبور ہوں گے کہ اللہ کی دی ہوئی روشنی سے تمام پردے اٹھا کر خود بھی راہِ راست پر ہو لیں اور دنیا کو بھی اطمینان اور سکون کی جنت کا راستہ دکھائیں۔ ہم مسلمانوں نے جب پھر سے ایک مرتبہ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو پھر دیکھئے گا کہ ہم جس مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں وہ کس طرح سونا بنجاتی ہے۔ ہماری ہر آرزو کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوگا کہ لیلۃ القدر کی صحیح عظمت کیا ہے۔ ہم اس کی قدر و قیمت اس وقت پہچانیں گے جب ہمیں قرآن کی قدر ہوگی اور جب قرآن کی قدر ہوگی تو اپنے آپ کی قدر ہوگی اور جب اپنی قدر ہوگی تو قدر و قیمت کے تمام غلط معیار نگاہوں سے گر جائیں گے۔

میں نے قرآنی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض الفاظ کی بندش اور شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ میرے نزدیک ٹھوس حقیقت ہے یہ نظام کیا ہے۔ کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے ہیں؟ یہ سب کچھ قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔

(دوسری تقریر)

(۲) روزوں کی عید

قرآن کریم کے نزول کی سالگرہ منانے کا وہ جشن مقدس جس کی ابتدا رمضان المبارک کے چاند سے ہوئی تھی آج اس کا آخری دن ہے۔ جس طرح اس تیوہار کی تقریب نرالی ہے اسی طرح اس کے منانے کا انداز بھی انوکھا ہے۔ جشن و مسرت کے تیوہار عام طور پر کسی انسان کی یادگار قائم رکھنے یا کسی تاریخی واقعہ کو محفوظ کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں اور دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں پر خدا کا وہ پیغام جو قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے کبھی مٹ نہیں سکتا، کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے لی ہے جو زندہ ہے اور کبھی مر نہیں سکتا۔ ایسا قائم ہے کہ اسے کبھی فنا اور زوال نہیں۔ یہ جشن عید اُسی خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب کے نزول کی یادگار ہے اور جب تک

دنیا باقی رہے گی یہ یادگار بھی باقی رہے گی۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخ اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مسلمانوں کو ملا تھا اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ اس سے پہلے ہوا ہے نہ اس کے بعد ہوگا۔ کہ جس کا محافظ خود اللہ ہو، اس میں کون ردوبدل کر سکتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔ واللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ وللہ الحمد۔

پھر اسے بھی دیکھئے کہ دنیا کے جشن عام طور پر کھیل، تماشا، راگ، رنگ، عیش و نشاط سے منائے جاتے ہیں لیکن شعائرِ الٰہی کی یادگار کے جشن منانے کیلئے ایک جداگانہ پروگرام تجویز کیا گیا ہے اس کے لئے مہینہ بھر سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اسلام کے معنی خدا کی اطاعت کے ہیں۔ زبردستی اطاعت نہیں بلکہ دل کی خوشی سے برضا و رغبت اطاعت۔ یہ اسی کی اطاعت ہے کہ ایک عبدِ مومن حرام اور ناجائز شے کو چھو نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں کسی شخص کے مال، جان، عزت، آبرو کو ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کیلئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کیلئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اٹھنے پائے۔ انھیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا۔ تاکہ یہ جہاد زندگی کے سخت ترین مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کے عادی ہو جائیں۔ انھیں راتوں کو مساجد میں جمع کیا گیا کہ قانونِ خداوندی کا وہ ضابطہ جس کے ماتحت انھیں زندگی بسر کرنا ہے پورے کا پورا مسلسل ذہن نشین ہوتا چلا جائے۔ گویا یہ ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (Refresher Course) تھا جس میں خدا اور بندے کے براہِ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی سالانہ محاسبہ (Stock Taking) تھا جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پرتال کر کے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہو گئی تو ان تمام کو یکجا جمع ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ انھیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ جو جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کے وعدے قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ پر سچے موتیوں کی طرح ابھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کریں جس کا اعلان ان کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لیکر ملتِ اسلامیہ کے مرکزِ محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں کی روشنی میں تمام ملت کیلئے مشترکہ نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں اس جشنِ مسرت کے مختلف اجزاء اور یہ ہے ان اجزا کی اجمالی تفصیل۔ انھیں سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں جن کے ہر گوشۂ بساط پر کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ اصل روح کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر کس طرح رفتہ رفتہ رسمی اجتماعوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے!

آپ عیدگاہ میں پہنچیں گے تو آپ کو نماز کے مسائل سمجھائے جائیں گے۔ بتایا جائیگا کہ صفیں کس طرح سیدھی رکھنی چاہئیں، دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہئے۔ کندھے کے ساتھ کندھا کس طرح ملانا چاہئے۔ ہاتھ کس طرح باندھنے اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں، تکبیریں کس طرح کہنی چاہئیں۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کی پابندی لازمی۔ لیکن ان ظاہری ارکان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ آپ وہاں جمع کس غرض کے لئے ہوئے ہیں۔ نماز آپ کو کیا پیغام حیات دیتی ہے۔ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے، جماعت ایک ہی کیوں ہوتی ہے متعدد کیوں نہیں ہو سکتیں۔ امام بھی ایک ہی کیوں ہوتا ہے اور اس کی ایک آواز پر بلا چون وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے۔ اس سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کی اطاعت سے کیوں سرتابی نہیں کی جاتی اور اس کے لئے بھی جہاں تک ممکن ہو غلطی سے بچنا کس قدر ضروری ہے کہ اس کے سہو کا کفارہ پوری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ جھکنا کیا ہے، یہ اٹھنا کیا ہے، کس طرح

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

وحدت افکار و کردار یعنی خیالات میں یکسانیت اور اعمال میں یک رنگی۔ قوموں کی زندگی کے یہی بنیادی اصول ہیں اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے تمام قومیں مختلف قسم کی جدوجہد کرتی ہیں لیکن اسلام میں یہ سب کچھ از خود موجود ہے۔ اور موجود ہے اس للّٰہیت کو لئے ہوئے جو مسلمانوں کا امتیازی نشان ہے لیکن آج مسلمانوں میں افکار اور اعمال کی وحدت کی جو کمی نظر آتی ہے اس کی وجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

ہمارے ان مناسک اور شعائر کی شکلیں باقی ہیں لیکن اصلی روح باقی نہیں رہی اور ان کی شکلیں بغیر روح کے ایسی ہی ہیں جیسے جسم بغیر جان کے یا نیام بغیر تلوار کے۔ لیکن اس کے باوجود ایک اہم نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ ہر چند ہمارے ان اجتماعوں میں آج وہ روح باقی نہیں رہی لیکن ان کی پابندی اور قیام نہایت ضروری ہے۔ اسلئے کہ ہماری فلاح اور سعادت جب بھی آئے گی انہی شعائر کی راہ سے آئے گی۔ آپ تاریخ انسانیت کے بہترین زمانہ یعنی عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نگاہ ڈالئے۔ نظر آجائے گا کہ فلاح اور سعادت کے چشمے انہی چٹانوں سے پھوٹے تھے اسلئے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ خدا کی زندہ کتاب ہمارے پاس ہے اسی میں اس کے رسولؐ کا اسوۂ مقدسہ، روشنی کے بلند مینار کی طرح ہماری راہ نمائی کے لئے موجود ہے۔ اس کی برگزیدہ جماعتوں کے کارنامے، مردہ دلوں میں نئے ولولے پیدا کرنے کے لئے ہمارے سامنے ہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ ہم ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو

پھر سے اسی پرانے نظام سے وابستہ کرلیں تو انہی چٹانوں سے ہمارے لئے زندگی کے چشمے اسی گرمجوشی سے ابلنے لگ جائیں گے۔ اور ان کی سیرابی سے ہماری ملت کے گلستاں میں پھر سے بہار آنے لگے گی۔

نہیں اقبال نومید اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

میری طرف سے آپ احباب کو مبارک ہو وہ عید جو ہمارے سامنے اسلامی زندگی کے جمال و جلال کی جھلک پیش کرکے اس بھولے ہوئے عہد و پیمان کی یاد تازہ کردیتی ہے کہ

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔ واللہ اکبر۔ اللہ اکبر وللہ الحمد

ہر قسم کی بڑائی اللہ کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ کبریائی اور ستائش کی سزاوار اسی کی ذات ہے۔

(تیسری تقریر از علامہ اسلم)

(۳) عید کا پیغام

آج عید ہے۔ یہ دن اس لحاظ سے سال بھر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا خوشی کا دن ہے کہ ایک مہینہ روزہ رکھنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

دن نکلتے ہی نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر اللہ کا نام لیتے ہوئے، اس کی حمد اور تکبیر کرتے ہوئے اور اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد پڑھتے ہوئے عیدگاہوں میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ جہاں سب کے سب ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر عید کا دوگانہ ادا کرتے ہیں اور اپنے مالک کے حضور میں عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ اس مبارک مہینے کے دنوں کے روزوں اور راتوں کی عبادتوں اور ریاضتوں کی قبولیت اور اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں اور خدا کی عظمت و جلال کے آگے خوف اور امید سے گڑگڑا کر اپنے دلوں کا خون آنکھوں کی راہ سے بہاتے ہیں۔

کتنا سنجیدہ تیوہار ہے اور کس قدر متین! سب کی زبانوں پر اللہ کا نام ہے اور دلوں میں اسی کا خیال۔ نہ شور ہے نہ شر، نہ شورش ہے نہ جوش، نہ کھیل ہے نہ کود، نہ نقل ہے نہ سوانگ۔ بس ایک رضائے الٰہی سب کے پیش نظر ہے اور سب اسی کے آگے سجدہ کرنے اور اپنی دلی آرزوئیں پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بے شک عید خوشی کا دن ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنے اکیلے رب کا بندہ ہے اس کی خوشی یہی ہے کہ اپنے رب کو اس کے احکام کی فرمانبرداری سے راضی کرے اور عید کے دن وہ امید رکھتا ہے کہ رمضان مبارک کی عبادتوں کی بدولت آج اس کی دعائیں قبول ہوں گی۔ اس کے گناہ بخشے جائیں گے اور اس کے قصور معاف ہوں گے، سچے بندوں کی خوشی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے مالک کو راضی کریں۔

اس خوشی کے دن ہر محلہ کے خوشحال مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ عیدگاہ جانے سے پہلے اپنے پڑوس کے غریب اور محتاج

بھائیوں کو عید کا صدقہ پہنچا دیں تاکہ وہ سوال سے بے نیاز ہو کر سب مسلمانوں کے ساتھ عید میں شریک ہو سکیں۔ آج کے دن ہر مسلمان نہا کر اپنے بہتر سے بہتر لباس پہن کر اور خوشبو لگا کر عید گاہ میں آتا ہے اور تمام دنیائے اسلام میں یہ اجتماع ہر جگہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عید کا مجمع نہ صرف مسلمانوں کی شائستگی اور خدا پرستی بلکہ ان کے اجتماعی جمال و جلال کا بھی مظہر ہے۔

عید کی نماز کے بعد مسلمان آپس میں گلے ملتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس خوشی کے دن دلوں سے کینہ اور دشمنی کو نکال دیں۔ اور بھائی سے بھائی گلے مل کر محبت کے عہد کو نئے سرے سے تازہ کریں۔ بعض بعض تو اس معانقہ کے اس قدر شائق ہوتے ہیں کہ اس متین مجمع کے وقار کے خلاف اس میں ہل چل اور بے ترتیبی ڈال دیتے ہیں۔ لیکن یہ رسم خود ہماری پیدا کی ہوئی ہے ورنہ ہمارے باہمی اتحاد اور محبت کی بنیاد اس سے بہت بلند ہے۔ وہ ایک اکیلے معبود کی رضا طلبی پر ہے جس کے آستانہ پر پوری ملت کی آرزوئیں اور دعائیں جھکتی ہیں اور گلے ملتی ہیں۔ اسی وحدتِ مقصد میں اتحادِ ملت کا راز مضمر ہے۔

آج مسلمانوں پر عام طور پر غربت اور بیکسی مسلط ہے اور اس وجہ سے ہماری عید غریبوں کی اور بیکسوں کی عید ہے لیکن اسلامی ملکوں میں اب بھی اس کی شوکت و شان دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہاں اہل نظر کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے بزرگوں کو حکومت، عزت، مال، جاہ اور ہر قسم کی نعمتیں بخشی تھیں اور اب کیا بات ہو گئی کہ ہم سے ایک ایک کر کے ان کو چھین رہا ہے۔ ہماری ملت کے اکثر افراد جس زوال کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں وہ اسقدر ہولناک اور جانگداز ہے کہ ہماری خوشی کا دن بھی جو آتا ہے وہ اس غم کو مٹا نہیں سکتا۔

آج اگر کوئی شخص ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو کر دنیا کی قوموں کا نظارہ کرے تو اس کو سب سے زیادہ تعجب مسلمانوں پر ہو گا جو صدیوں تک بے نظیر عروج حاصل کرنے کے بعد جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں اب عام طور پر تنزل میں پڑے ہوئے ہیں اور دوسری قومیں دن رات عروج اور ترقی حاصل کر رہی ہیں۔ اس لئے یہ ایسا امر ہے جس کے اوپر مفکرینِ اسلام کو نہایت سے زیادہ غور کرنا چاہیئے تاکہ وہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب کے ازالہ کی کوشش کر سکیں میرے نزدیک ہماری پستی کے بڑے سبب دو ہیں:-

(۱) پہلا یہ ہے کہ اس امت کی سربلندی اور اس کا عروج سب قرآن کریم کی پیروی کی بدولت ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ امتِ اسلامیہ اس کتاب الٰہی کی تعمیل سے جو ہمارے لئے دینی اور دنیاوی اور اجتماعی اور انفرادی ہر قسم کی تعلیمات اور حقیقی تعلیمات کا مجموعہ ہے دور ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اب یہ دوری اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ یہ کہتے ہوئے میری گردن ندامت سے جھک جاتی ہے کہ جو کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا دستور العمل تھی آج تمام امت اسلام میں جو مراکو سے چین تک پھیلی ہوئی ہے کوئی قوم یا جماعت ایسی نہیں ہے جس نے اس کو عملاً اپنی زندگی کا قانون بنایا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا یہ دینی اور ذہنی مرکز جو ہماری ہدایت کا سرچشمہ ہے متروک ہو گیا اور اس کے قوانین اور ضوابط خاص کر اجتماعی، خود مسلمانوں میں رائج نہیں رہے۔ اور اس کے اوپر ہمارا ایمان محض اعتقادی اور زبانی رہ گیا جس کی

وجہ سے امت سینکڑوں فرقوں میں منقسم ہوگئی۔ اسلئے مسلمانوں کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ اس کتاب الٰہی اور نورِ مبین کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں تاکہ اس کی روشنی میں باہمی فرقہ بندیاں اور مذہبی جھگڑے مٹ جائیں اور سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہو کر متحد ہو جائیں۔

(۲) دوسرا سبب اور نہایت اہم سبب ہماری پستی کا ہماری "لامرکزیت" یعنی مرکز کا نہ ہونا ہے۔ اور امت اسلامیہ اپنا مرکز کھو دینے سے پستی میں جا گری ہے۔

آج تمام عالم اسلام ایک بے سری جماعت ہے جس کا نہ کوئی مرکز ہے نہ کوئی نظام ہے ہم کو خدا نے صرف اپنا ہی غلام بنایا تھا اور اس امیر کی جو قرآنی احکام نافذ کرے اطاعت کا حکم دیا تھا۔ جب تک امت اس کے اوپر عمل کرتی رہی برسرِ عروج رہی لیکن بہت تھوڑے عرصے کے بعد خود ہمارے ہی ہاتھوں یہ مرکز ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے مختلف حکومتوں، سلطنتوں اور بادشاہتوں میں ملت تقسیم ہوگئی۔ اور ایک کو دوسرے سے سوائے اسلامی اشتراک کے اور کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔

مرکز کے فنا ہو جانے سے ملت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا اور کوئی اجتماعی قیادت اور راہنمائی نہیں رہی جس کی وجہ سے عمل کی صلاحیت گم ہوگئی اور زوال آگیا اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ پھر دوبارہ ملتِ اسلام متحد ہو کر ایک مرکز پر آجائے تو ہم کو ایسے امیر کی اطاعت اختیار کرنی چاہیے جو قرآن کے مطابق چلائے اور ہر ہر حصہ کے مسلمان ایک مرکز پر آجائیں تاکہ رفتہ رفتہ پوری ملت متحد ہو سکے۔ ورنہ ڈر ہے کہ انفرادیت اور لامرکزیت ہلاکت تک پہنچا کر نہ چھوڑے۔

یہ دونوں باتیں جو میں نے عرض کی ہیں قیاسی نہیں ہیں بلکہ ہمارے دینی فرائض ہیں۔ قرآن کریم پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ اس پر عمل کرنا نجات ہے۔ اسی طرح اطاعتِ امیر جس کے احکام قرآن میں کھلے کھلے اور واضح طور پر دیئے گئے ہیں۔ ہر مسلم پر فرض ہے کہ ان دونوں یعنی قرآن اور امیر سے ملت عملی طور پر متحد ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں وحدتِ ملت کے اور بھی اسباب ہمارے اندر موجود ہیں۔ تمام دنیائے اسلام میں یکساں ہر جگہ پانچوں وقت اذانیں پکاری جاتی ہیں اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ تمام دنیائے اسلام سے ہر قوم اور ہر ملک کے نمائندے دریا، کوہ اور بیابان قطع کرتے ہوئے حج کے موسم میں مکہ میں آتے ہیں اور شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ کر ایک لباس میں میدانِ عرفات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آج کی عید بھی تمام دنیائے اسلام میں یکساں اور ایک ہی انداز سے منائی جاتی ہے۔ اسلئے ہمارے اتحاد میں کوئی دشواری نہیں ہے اور امت اسلامیہ کیلئے اللہ اور رسول کی ہدایت اور تعلیم کی روشنی میں فلاح و نجات کی راہ میں قدم رکھنا اور دینی و اعتقادی مرکز قرآن کریم کو بنانا اور عملی مرکز اطاعت امیر کو اختیار کرنا عین اس کے ایمان کے مطابق ہے۔

میں اپنے تمام بھائیوں بہنوں کو عید کی مبارکباد دیتا ہوں اور خلوص دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایک دل اور ایک زبان کر دے اور اپنی رحمت سے ہمارے قصوروں کو معاف کر کے ہم کو صحیح راستہ پر چلائے۔ (اسلم جیراجپوری)

نقد و نظر

پیامِ مشرق
(عربی ترجمہ)
تبصرہ از۔ پرویز

شروع سال کا ذکر ہے، محبی سید عبدالواحد صاحب (انسپکٹر جنرل اوف فارسٹس و سکریٹری مجلس اقبال، پاکستان) میرے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ سفیر مصر تم سے ملنا چاہتے ہیں اور وجہ تعارف، تمہاری اقبال سے وابستگی ہے۔ میں طبعاً بڑے بڑے لوگوں سے ملنے سے اجتناب کرتا ہوں اور یہ اجتناب اچھے خاصے تکدر کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے، جب یہ کہا جائے کہ فلاں صاحب تم سے اس لئے ملنا چاہتے ہیں کہ اقبال یا قرآن کے متعلق تم سے کچھ پوچھیں حالانکہ یہ وہ موضوع ہیں جو میرے لئے عنوانِ زیست ہیں۔ یہ اس لئے کہ مجھے مدت العمر کے تجربے نے بتا دیا ہے کہ عام طور پر ان لوگوں کو اقبال یا قرآن کے سمجھنے کی ضرورت کب پڑتی ہے اور وہ بالعموم کس قسم کا قرآن سمجھنا چاہتے ہیں۔ بنابریں میں واحد صاحب کی بات کو ٹالنا چاہتا تھا لیکن ان کا اخلاص اور اقبال سے ان کا عشق (جو انھیں اکثر کوچۂ رقیب تک میں بھی سر کے بل لے جاتا ہے) ایسا نرم پھندا نہیں ہوتا جس سے آسانی سے چھٹکارا ہو جائے۔ اس لئے مجھے طوعاً و کرہاً ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔

میں گیا تو اس طرح پا بجولاں، لیکن دو چار باتوں کے بعد ہی میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اگر میں نہ آتا تو زندگی کی کتنی بڑی نعمت سے محروم رہ جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ (اس تمام زیبائش و آرائش اور جاہ و طمطراق کے باوجود جو اس دور میں .... سفارت خانوں کے سیاسی تقاضوں کا جزو بن چکی ہے) میں سفیر مصر کے قصر شاہی میں نہیں بلکہ ایک مردِ درویش کی معیت میں، قاہرہ کے کسی عظیم کتب خانے میں بیٹھا، دنیا بھر کے جلیل القدر ائمہ ادب و شعر سے متعارف ہو رہا ہوں۔ میرے میزبان کی گفتگو میں نہ تکلف تھا نہ آورد۔ نہ نمود تھی نہ نمائش۔ ان کی سادگی اور خلوص اس گہرائی کے آئینہ دار تھے جو صحیح فکر و نظر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انھوں نے نہ کسی رسمی تعارف کی ضرورت سمجھی، نہ میرے بود و ماند کے متعلق کچھ پوچھا۔ اقبال سے آغاز سخن ہوا، اقبال ہی موضوع سخن رہا اور اقبال ہی پر خاتمہ کلام ہوا۔

یہ تھی ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک، سفیر مصر متعینہ پاکستان سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اقبال سے انھیں عشق ہے۔ ایسا عشق جس کی مثال مشکل کہیں اور مل سکے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عشق ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اور اب اپنے زور دروں سے ایک شفاف چشمہ کی طرح بے تابانہ ابلے چلا آ رہا ہے۔ عربی، ڈاکٹر عزام بے کی مادری زبان ہے لیکن ان کی عربی علمی اور کتابی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم "عجمیوں" کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی بلکہ ہم اس کی حلاوت اور طلاقت سے بھی لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ فارسی میں انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور کلام اقبال سمجھنے کیلئے اردو بھی سیکھی

تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس کے علاوہ انھیں انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل ہے۔

شعر کہنے پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ ہم نثر میں اس آسانی سے گفتگو نہیں کر سکتے جس سلاست اور روانی سے وہ شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ انھوں نے اقبال کے کسی شعر کا ترجمہ کیا۔ میں نے کہا کہ ادائیگی مفہوم میں ذرا سا نازک فرق رہ گیا ہے۔ کہا، بہت اچھا! یوں نہ سہی یوں سہی۔ اور دوسرا شعر پڑھ دیا۔ یعنی وہ اس بے تکلفی سے شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں گویا کسی اور کے اشعار زبانی یاد ہیں اور وہ انھیں دہرائے جاتے ہیں۔ اقبال کے کلام کا منظوم ترجمہ، جس میں نہ صرف اصل کی روح ہی قائم رہے بلکہ اس کی شوکت اور رفعت میں بھی فرق نہ آنے پائے، آسان بات نہیں۔ اس کے لئے اقبال کے گہرے مطالعے کے ساتھ زبان پر بڑے عبور کی ضرورت ہے۔ محترم ڈاکٹر عزام بے کو مبدأ فیض کی کرم گستری نے ان تمام خصوصیات سے نوازا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا انداز تجسس ایسا طالب العلمانہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی بات کے صاف کر لینے میں بھی نہ کوئی باک سمجھتے ہیں نہ اسے اپنی "کسرِ شان" تصور کرتے ہیں۔

اقبال کے ساتھ ان کے بے پایاں عشق اور علم کے ساتھ ان کی بے انتہا شیفتگی کا نتیجہ ہمارے سامنے پیامِ مشرق کے عربی (منظوم) ترجمہ کی صورت میں جلوہ افروز و بصیرت نواز ہے۔

اقبال کا پیغام، جو درحقیقت قرآن کا پیغام ہے۔ اس دورِ بے سوز و بے نور کے انسان کیلئے، جس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گردش صورت مار

نشیدِ زندگی و نوید کامرانی ہے۔ اسلئے اس پیغام کا ترجمہ دنیا کی جتنی زبانوں میں بھی ہو سکے کم ہے۔ خود ان کی اپنی دعا یہ تھی کہ

میرا نور بصیرت عام کر دے

لیکن پیامِ اقبال کا عربی زبان میں ترجمہ ایک اور خصوصیت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پیغامِ اقبال کی اولیں مخاطب ملت اسلامیہ ہے۔ ملت بلا حدود و قیود۔ انھوں نے جب اردو کی جگہ فارسی کو بطور پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے تو اس سے بھی یہی مقصود تھا کہ ان کے پیام کا دائرہ اور وسیع ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود، ملت اسلامیہ کا معتدبہ حصہ جس کی زبان عربی ہے اس پیغام سے ناآشنا رہا۔ پیامِ اقبال کا عربی ترجمہ اس کمی کو پورا کرنے کا موجب ہے۔ اس ترجمے کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ہم میں اور دیگر ممالکِ اسلامیہ میں اُس صحیح رابطہ کے پیدا ہو جانے کی توقع ہے جس کا مدار "یک زبانی" کے بجائے "یک دلی" پر ہوتا ہے[1]۔ بلکہ اس سے ہمارے عربی بولنے والے بھائیوں کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ عربی مبین میں نازل شدہ قرآن کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اُس وقت حضرت علامہؒ کے اس لطیف نکتہ کا مطلب بھی سمجھ میں آجائیگا کہ

---

[1] یک دلی از یک زبانی بہتر است۔

تو عرب ہو یا عجم ہو، تیرا لا الٰہ الا حرفِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

جہاں تک ترجمہ کی خوبیوں کا تعلق ہے اس کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی!

محترم مترجم نے، روح و معانی کے علاوہ، اصل کے تتبع میں یہانتک کوشش کی ہے کہ اسلوب بیان میں بھی قدم بقدم چلا جائے مثلاً پیام مشرق کی نظم (بعنوان پند باز بابچہ خویش) کا انداز یہ ہے:-

تو دانی کہ بازاں زیک جوھراند دل شیر دارند و مشت پر ند

اس کا ترجمہ ہے:-

تعلم بنی بأن الصقور لھا قلب لیث وجسم صغیر[1]

یا مثلاً پیام مشرق میں ہے:-

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من جگر گرمی صحرا نہ تو داری و نہ من

ترجمہ ہے:-

لھیب الوجد من اسماء ، لا عندی ولا عندك
وحر القلب فی بیداء ، لا عندی ولا عندك

یہ دو شعر محض مثالاً پیش کر دیئے گئے ہیں ورنہ ساری کتاب کا انداز بیان ایسا ہی ہے۔

شروع میں محترم چوہدری نذیر احمد خاں صاحب، وزیر صنعت، حکومت پاکستان (صدر مجلس اقبال) کی طرف سے تصدیر ہے، جس کا اختصار، اقبال کے ساتھ چوہدری صاحب کی عقیدت اور شیفتگی کو اس طرح نمایاں کر رہا ہے جس طرح تنگی پیراہن سراپائے محبوب کو سانچے میں ڈھال کر نکھارا اور ابھار دیتی ہے۔ اس کے بعد مترجم کی طرف سے مقدمہ و تعارف ہے۔ بعد ازاں حضرت علامہؒ کے مقدمہ پیام مشرق کا عربی ترجمہ۔ کتاب کے آخر میں قریب چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی، مثنوی اسرار و رموز کے انداز کی ایک طویل نظم (از صاحب مترجم)۔ اس نظم میں ڈاکٹر عزام بے نے اقبال کی تعلیم کا ملخص اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر اقبال کا تعارف ہے۔

بین الاقبال من سر الحیاۃ وأزال الستر عن نور النجاۃ
بین الاقبال من سیر الزمان وافاض النور من ھدی القرآن
(وغیرھا)

اور پھر اثر و درد میں ڈوبی ہوئی دعا۔

فالق الاصباح رب المشرقین باسط اللیل ورب المغربین

---

[1] عربی میں صقور اور صغیر ہم قافیہ ہو سکتے ہیں۔

انقذ الانسان من هٰذا الغمم　　انجیبن من بغیها هذی الامم
فاهد بالایمان عقلاً حائرا　　واجعل القلب علیه آمرا

حضرت علامہؒ نے شعرائے عرب سے تخاطب فرماتے ہوئے کہا تھا:۔

بخاکِ ما دلے، در دل غمے ہست　　ہنوز ایں کہنہ شاخے را نمے ہست
بہ افسونِ ہنر آں چشمہ بکشائے　　درونِ ہر مسلماں زمزمے ہست

اور یہ کہ

بدہ باخاکِ او آں سوز و تابے　　کہ زاید از شب او آفتابے
نوا آں زن کہ از فیضِ تو او را　　دگر بخشند ذوقِ انقلابے

یہ روحِ اقبالؒ کا اعجاز اور اس کے گریۂ نیم شبی کا اثر ہے کہ اسے "نواخوانانِ عرب" میں سے ایسا صاحب قلب و دماغ داعی مل گیا ہے جس نے اس کے انقلاب آفریں پیغام کو بلادِ عربیہ میں عام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے[۲]۔ خدا کرے کہ اقبالؒ نے جو خواب آج سے بہت عرصہ پہلے دیکھا تھا کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اس کے پیغام کی اشاعت سے وہ خواب سچا ہو جائے اور انسان کی تقدیر پھر سے بدل جائے۔ بہرحال سردست اتنا تو ہوا کہ اقبال کے دل میں جو آرزو ہمیشہ مچلا کرتی تھی اور جس کی غمازی اس کے اس قسم کے اشعار کیا کرتے تھے کہ

عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے میری　　نالہ ہندی ہی سہی، لَے تو حجازی ہے میری

وہ آرزو اس شکل میں پوری ہو گئی کہ اقبالؒ کی مے کو خُم بھی حجازی مل گیا اور لَے کے ساتھ خود اس کا نالہ بھی یثربی بن گیا۔[۳]

میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ پاکستان کے پورے حلقۂ اقبالؒ کی طرف سے

(۱) بہ صمیم قلب، ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عزام بک کی خدمت گرامی میں جنہوں نے عالم عربی کو فکر اقبال سے روشناس کرانے میں اس سعی بلیغ اور حسن کاوش سے کام لیا جس پر ہم سب بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

---

[۱] بگواز من نواخوانانِ عرب را۔ (ارمغانِ حجاز)

[۲] چنانچہ پیام مشرق کے بعد، ڈاکٹر عزام بے، حضرت علامہ کے دوسرے کلام کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔

[۳] دلچسپ، محترم حلیم صاحب نے سفیر مصر ہی کے دولتکدہ پر یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت علامہ علی گڑھ تشریف لائے تو کچھ لڑکوں نے پوچھا کہ آپ نے اردو چھوڑ کر فارسی میں کیوں شعر کہنے شروع کر دیے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ اسلئے کہ میری عربی اتنی اچھی نہیں!

(ii) دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہوں مجلس اقبال پاکستان (کراچی) کی خدمت میں جس نے اس کتاب کی نشر و اشاعت کا اہتمام اس حسن و خوبی سے کیا۔ اور

(iii) قابلِ صد مبارکباد سمجھتا ہوں اہلِ مصر کو جن کے ایسے قابلِ قدر نمائندہ نے رابطہ عالمِ اسلامی کے سلسلہ میں ایک ایسا محکم اور بنیادی قدم اٹھایا ہے جس کے نتائج کا مقابلہ ہزار سیاسی وثائق و عہود بھی نہیں کر سکتے۔ کہ حقیقی رابطہ قلب و نگاہ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وحدتِ فکر ہی وحدتِ عمل کی اساس و بنیاد بن سکتی ہے۔

یہ کتاب (مجلد) ساڑھے سات روپے میں "کتاب لمیٹڈ" رابسن روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔ (پرویز)

خیرِ کثیر
(اردو ترجمہ)

امت میں جس قدر ائمہ فکر و نظر پیدا ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کا ان میں ایک خاص مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مجتہدانہ نگاہ اور مجددانہ دماغ عطا کیا تھا۔ انھوں نے اپنے انداز میں کتاب اور سنت کی اشاعت میں جس قدر حصہ لیا ہے، اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس پر غور کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے تھے۔ ایک بڑے آدمی کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے زمانے کا امام ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے شاہ صاحب علیہ الرحمۃ بیشک اپنے زمانے کے امام تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمیں ان کے نتائجِ فکر میں کئی ایک مقامات پر اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس کی وجہ وہ دور اور اس کی مجبوریاں تھیں۔ اگر شاہ صاحب اِس زمانے میں پیدا ہوتے تو معلوم خود اپنے مقام سے بھی کس قدر آگے ہوتے۔

لیکن شاہ صاحبؒ کی زندگی کا ایک گوشہ ایسا ہے جو ہم ظاہر بینوں کی حدِ نگاہ سے ماوراء ہے اور یہ ہے اسرار [illegible] ن کا گوشہ۔ جو کچھ وہ اس مقام میں کہتے ہیں اُسے دیگر ائمہ تصوف کے اقوال کی طرح "اہلِ حال" ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس باب میں [illegible] مشہور ہیں۔ ایک تفہیمات اور دوسری 'خیرِ کثیر' جس کا اردو ترجمہ اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ یہ ترجمہ عبدالرحیم صاحب [illegible] پروفیسر عربی، اسلامیہ کالج پشاور کی محنت کا نتیجہ ہے جسے "ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول سورتی، تاجرانِ کتب، جامع محلہ، بمبئی" نے شائع کیا ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت سے "ثواب" کے علاوہ اور کیا فائدہ مقصود تھا۔ اس لئے کہ جو "اہلِ حال" اسے سمجھنے کے اہل ہیں وہ اسے عربی میں بھی سمجھ لیتے اور جن کی سمجھ میں عربی کی کتاب نہیں آ سکتی وہ اسے اردو میں بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مثلاً آپ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ

اسمائے حسنیٰ میں سے بعض ایسے اسم ہیں جن کو حادث کہا جاتا ہے جو نظامِ حوادث کا موجب ہیں۔ اس قول کی حقیقت

جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خاص طور پر سمجھائی ہے یہ ہے کہ قرب کے اقسام میں سے ایک قسم قربِ فرائض ہے۔ اسکی کنہ و حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں کو جب قرب (؟) حاصل ہوتا ہے تو باری تعالیٰ اعیانِ عباد میں تجلی فرماتا ہے۔ اس تجلی کی ایک طرح کا تحقق ظہور میں آتا ہے۔

ساری کتاب اسی قسم کی عبارت پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ کتاب دراصل اہلِ فلسفہ کے رد میں لکھی ہے جیسے امام غزالیؒ نے تہافتہ الفلاسفہ لکھی تھی۔ ہمارے دور میں نہ وہ فلسفہ رہا ہے نہ اس فلسفے کے اعتراضات۔ اس لئے اس لحاظ سے بھی اس کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت سے کچھ فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا تھا۔ باقی رہا تصوف کا سوال۔ سو اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی تحقیق سے قارئین ناواقف نہیں۔ ہمارے نزدیک تصوف، اسلام میں باہر سے آیا ہے اور بعد کا اضافہ ہے۔ یہ ایک فن ہے جس کا اکتساب مسلم اور غیر مسلم سب کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس فن کے متعلق اسلامی اور غیر اسلامی کی تخصیص و تفریق ایسی ہی ہے جیسے کوئی اسلامی اور غیر اسلامی منطق کی تفریق کرے۔ زیرِ نظر چھوٹی تقطیع کے ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ نیوز پرنٹ پر چھپی ہے اور پبلشرز سے -/3/8 روپے میں مجلد مل سکتی ہے۔

Marxism or Islam مارکسیت یا اسلام؟ (انگریزی)	مصنفہ مظہر الدین صاحب صدیقی۔ مطبوعہ نشاۃ ثانیہ پبلیکیشن حیدرآباد دکن۔ قیمت ۶؎ ملنے کا پتہ: محمد اشرف، تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور۔

عام طور پر مارکسیت (اشتراکیت) کو محض ایک معاشی نظام ہی سمجھا جاتا ہے اور اس معاشی نظام کا مقابلہ اسلام کے معاشی نظام سے کیا جاتا ہے۔ یہ مارکسیت اور اسلام دونوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ مارکسیت ہرچند معاشرہ انسانی کی معاشی تنظیم ہے لیکن اس کا جداگانہ فلسفۂ زندگی بھی ہے جس پر اس کے نظمِ معاشی کی اساس ہے۔ اس کے نظمِ معاشی کو اس فلسفۂ زندگی سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی کوشش ناممکن ہے۔ یہی صورت اسلام کی ہے۔ اسلام اپنا خصوصی فلسفۂ حیات رکھتا ہے اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔ فلہٰذا ان دونوں نظاموں کو زیرِ بحث لانے کے لئے لازمی ہے کہ سب سے پہلے ان کے خصوصی فلسفہ ہائے حیات کا تجزیہ کیا جائے اور اس کی روشنی میں ان نظام ہائے سیاسی و معاشی کا مطالعہ کیا جائے۔

محترم صدیقی صاحب نے مارکسیت کے فلسفہ کی تشریح و تبیین میں کافی توجہ صرف کی ہے اور متعدد عنوانات کے تحت اس پر بحث کی ہے۔ انھوں نے مارکسیت کے نظریات متعلقۂ تاریخ، ریاست، مابعد الطبیعیات، فطرت، قوانینِ فطرت، اخلاق، مذہب، حقائقِ ابدی وغیرہ کا محنت اور کاوش سے علمی جائزہ لیا ہے اور جہاں تک مارکسیت کے فلسفہ کے علمی مطالعہ و تجزیہ کا تعلق ہے، ان کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ نفسِ مضمون اور اندازِ بحث دونوں علمی روش کے مظہر ہیں۔ اگر یہ کتاب محض مارکسیت کے مطالعہ تک محدود رہتی تو اسے اس صنفِ ادب میں ممتاز مقام حاصل ہوتا لیکن کتاب کا جو حصہ اسلام سے متعلق ہے اس میں نہ تو آپ کی روش علمی

رہی ہے اور نہ ہی آپ مسلک عامہ سے ہٹ کر اسلام کا مطالعہ کر سکے ہیں۔

علاوہ ضمنی مباحث کے کتاب کے آخری تین ابواب اسلامی نظام کی توضیح و تشریح کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ ان ابواب ثلاثہ میں سے پہلا باب ان نقاط سے متعلق ہے جو اسلام اور مارکسیت میں متفق طور پر پائے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس امر کے کہ جب دو فلسفہ ہائے حیات ایک دوسرے سے بخطِ مستقیم برعکس ہوں، تو ان کے فروع میں اشتراک و اتفاق کے نقاط کی تلاش غیر علمی ہے، آپ نے ایک نقطۂ اتفاق یہ بھی بیان کیا ہے کہ مارکسیت اور اسلام دونوں مجرد نظریات بافی کے مخالف ہیں اور اس ضمن میں فرمایا ہے:

> روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلعم نے دو صحابیوں کو مسئلہ جبر و قدر پر بحث کرتے ہوئے سن لیا تو آپ نے بڑی ناراضی کا اظہار فرمایا اور انھیں اس قسم کی بحثوں سے اجتناب کرنے کی تاکید فرمائی۔

اس سے بالکل متصل فقرے میں آپ نے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کی حدیث کا حوالہ دیکر یہ دعویٰ کیا ہے کہ "قرآن اور حدیث نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ وہ علمی دنیا سے متعلق مسائل و معاملات میں آزادانہ تحقیق و تجسس سے کام لیں! مسئلہ جبر و قدر ایک 'مجرد' مسئلہ ہے یا 'علمی' دنیا سے متعلق؟ اس کا جواب مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ سے پوچھئے!

محترم مصنف کتاب کا تصور مذہب روایتی مولویانہ تصور سے چنداں مختلف نہیں۔ مارکسیت سے متعلق ان کی علمی بحث اور اسلام سے متعلق ان کی مولویانہ بحث بڑی متضاد معلوم ہوتی ہے۔

ایک مقام پر مارکسیت کے تصور مذہب پر بحث کرتے ہوئے اسلام کا ضمناً ذکر کر کے آیت قرآنی "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کا حوالہ دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کیلئے اصلی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے، اور حاکم وقت کی اطاعت ہنگامی ہے۔ اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے سلسلہ میں مسلمان ارباب مذہب نے جو افسوس ناک خلط مبحث روا رکھا ہے اس کے پیش نظر صدیقی صاحب کا یہ کہنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں "خدا" اور "قیصر" کی دوئی کا تصور نہیں پایا جاتا۔ اس "یک نگہی" تصور کا مسلمانوں کی ذہنیت پر اتنا قوی اثر بتایا گیا ہے کہ

> ساری اسلامی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی حاکم یا گروہ یا فرقہ نے قانون فقہ کی اطاعت سے انکار کیا ہو یا انھیں متبادل قوانین سے بدلنا چاہا ہو۔ اور اس کی بھی مثال نہیں مل سکے گی کہ پروٹسٹنٹ ازم کی طرح کوئی ایسی اصلاح مذہب کی تحریک اٹھی ہو جس نے ہر قوم اور ہر حاکم کو مذہبی معاملات میں خود مختار بنا دیا ہو۔ . . . . .
> پیروان اسلام "قومی چرچ" کے تصور تک سے ناآشنا ہیں۔ . . . (اسلام میں) کوئی "مذہبی" تیکس نہیں . . . . . .

بہت بڑا دعویٰ ہے جو اقتباس بالا میں صدیقی صاحب نے کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کے سرسری مطالعہ سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ فقہی اور مذہبی فرقوں نے باہمی عداوت و جدال میں کس قدر اشتداد برتا۔ ہر چند یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مذہبی فرقوں نے اپنے آپ کو مسلمان

کہلانا ہی پسند کیا۔ لیکن ان فرقوں نے اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کو اعلانیہ کافر قرار دیا۔ یہانتک کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو ایک طرف ایک دوسرے کی مسجدوں تک میں جانا بمنزلہ کفر سمجھا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں "چرچ" قومی وحدتوں میں منقسم نہیں ہوا۔ لیکن علماً مسلمانوں نے اسلام کی وحدت کو سیاسی اور مذہبی اعتبار سے جس طرح پارہ پارہ کیا، وہ ایک دلخراش داستان ہے اور طالب علمان تاریخ سے مخفی نہیں۔

صدیقی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "(اسلام میں) کوئی مذہبی ٹیکس نہیں"۔ لیکن آگے چل کر جب آپ نے اسلام کے نظام معاشی پر بحث کی ہے تو آپ نے زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> زکوٰۃ کی مدات مصارف کو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ چنانچہ حکومت کو بالکل یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اس آمدنی کو کسی اور مصرف میں لائے۔

سردست اس بحث کو جانے دیجئے کہ قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف کون کون سے بتائے ہیں، ذرا زکوٰۃ کے پیش کردہ تصور کو ملاحظہ کیجئے صاف پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے ذرائع آمدنی دو طرح کے ہوں گے۔ ایک دنیوی، دوسرے مذہبی۔ دنیوی ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی کو حکومت، جہاں جی چاہے، خرچ کر سکتی ہے، لیکن زکوٰۃ کی آمدنی کو متعین مدات پر ہی صرف کیا جا سکتا ہے۔ یہ متعین مدات آپ نے قرآن کی آیت ۶۰ سے لی ہیں جو صدقات سے متعلق ہیں، نہ کہ زکوٰۃ سے۔ زکوٰۃ کو عام طور پر مذہبی ٹیکس ہی سمجھا جاتا ہے اور مسلمان اسی حیثیت سے اپنے آپ کو اس کی ادائیگی پر مکلف سمجھتا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرتے چلے آئے ہیں، اور ابھی تک اسی روش پر قائم ہیں۔ صدیقی صاحب نے البتہ یہ گنجائش پیدا کر دی ہے کہ زکوٰۃ بھی حکومت ہی کے خزانے میں داخل ہونی چاہئے اور شاید اسی وجہ سے آپ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام میں کوئی "مذہبی" ٹیکس نہیں۔ اسلام میں واقعی کوئی مذہبی ٹیکس نہیں کیونکہ اسلام "مذہب" ہی نہیں۔ لیکن علماً مسلمانوں نے اسلام کو جو کچھ بنا دیا ہے وہ مذہب کے تصور سے کسی طرح بلند نہیں اور صدیقی صاحب نے اس تصور کو صحیح کرنے کی کوئی اجتہادی کوشش نہیں فرمائی۔ بلکہ ان کا اپنا تصور بھی اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں قرآن نے خمس اللہ اور رسول کے لئے مقرر کیا ہے۔ صدیقی صاحب نے "اللہ اور رسول" کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے "یعنی سٹیٹ" گویا "اللہ اور رسول" سے مراد حکومت ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ آپ نے بعض مفسرین کی اتباع میں اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت لیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور صرف مال غنیمت تک محدود ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے آپ نے "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کا ایک مقام پر حوالہ دے کر "اولی الامر" کو حاکمان وقت کہہ کر خدا اور رسول کی حاکمیت کا جس انداز سے ذکر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے خدا اور رسول سے مراد "خدا" اور "رسول" ہیں، نہ کہ مرکز ملت، جیسا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں آپ مراد لے رہے ہیں۔ اور خدا سے مراد ہے قرآن اور رسول سے مراد ہے احادیث۔ اگر "خدا اور رسول" سے

واضح طور پر مرکزِ ملت مراد لیا جائے تو فہمِ قرآن کے سلسلہ میں بیشتر الجھنیں دور ہو جائیں۔

اسلام کے متعلق جو بحث کی گئی ہے اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مصنف کی "مذہب" اسلام کے متعلق قریباً مروج نظریات پر ہی نگاہ ہے اور وہ بحث کے انداز اور طرزِ استدلال کو انہی کے مطابق ڈھال رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی ملکیت اور زمینداری وغیرہ مسائل کے متعلق ان کی روش میں تضاد واقع ہو گیا ہے۔ کتاب کا آخری فقرہ آزادرائے کا حامل معلوم نہیں ہوتا بلکہ اشتراکیت اور اسلام میں سعیٔ مفاہمت کا غماز:

> ظاہر ہے کہ ایسا (اسلامی) نظام اس آخری حد تک نہیں جاتا کہ انفرادی ملکیت کو بالکل ختم ہی کر دے۔
> البتہ اس میں بہت حد تک وہ معاشی لائحہ عمل موجود ہے جسے کیمونسٹ تحریک نے پیش کیا ہے۔

بہرحال، یہ کتاب اگر اسلام کے معاشی نظام کیلئے نہیں تو کم از کم مارکسیت کے فلسفہ کو سمجھنے کیلئے ضرور مفید ہے۔

مسلمان اندلس میں

مصنف رشید اختر ندوی۔ شائع کردہ: پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ، لاہور۔ ضخامت ٨٣، صفحات۔ قیمت مجلد، آٹھ روپے بارہ آنے (خاص جلد دس روپے) کتابت، طباعت، عمدہ

اندلس ـــ "خون مسلماں کا امیں" اور مسلماں کی نظر میں "مانند حرم پاک" ـــ چشم ملت کا وہ آنسو ہے جس میں بیک وقت عروج و زوال اسلامی کی داستان پرشکوہ و عبرتناک جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ اس سرزمین پاک میں علم و تہذیب کی وہ قندیل فروزاں ہوئی جس نے ظلمتکدہ یورپ کو بقعۂ نور بنا دیا لیکن یورپ نے کسب نور کر کے اس سرچشمۂ نور و فیض کو ہمیشہ کیلئے بجھا دیا۔ اس بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہر حساس قلب سے اب تک اٹھ رہا ہے۔

اندلس ایک طرف یادگار ہے اس درخشاں دورِ تہذیب و تمدن کی جس کی طرح عربوں نے ڈالی اور دوسری طرف اس کا نام یاد دہانی ہے اس غیر انسانی تظلم و بربریت کی جس کا مظاہرہ عیسائیت نے کیا۔ اس تصویر کے دونوں رخ فقید المثال ہیں۔

داستانِ اندلس بصائر و عبر سے مملو ہے۔ ہر چند ضرورت اس امر کی ہے کہ اس داستان کی ایک ایک کڑی اور اس کے ایک ایک گوشے کو امعان نظر سے دیکھا جائے لیکن مسلمانوں نے عموماً اس سے اغماض برتا ہے۔ تاریخ کے اس گوشے پر ہی کیا منحصر ہے مسلمانوں نے اپنے ماضی کے محاسن کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا رکھا ہے۔

پیش نظر کتاب اس افسوسناک کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ رشید اختر ندوی صاحب اردو داں طبقہ میں بخوبی متعارف ہیں اور ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب پر انہوں نے کافی محنت کی ہے۔ بقول ان کے اس پر "تین سال صرف ہوئے اور میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ کوئی غلط اور غیر مستند روایت درج نہ ہونے پائے"۔ یہ ضخیم کتاب بطور تاریخ لکھی گئی ہے

لیکن انداز عموماً ناول کا سا اختیار کیا گیا ہے۔ مصنف کی تاریخ نویسی ان کی ناول نویسی کو مغلوب نہیں کر سکی۔ اس طرح گو کتاب تاریخ کا روکھا پن اس میں نہیں تاہم اس کا درجہ اعلیٰ علمی تاریخی کتاب کا سا نہیں ہو سکا۔

مصنف کی کوشش بہرحال مغتنم ہے اور اگر اس سے مسلمان داستان اندلس کے حقائق و عبر کی طرف متوجہ ہو سکیں تو ان کی سعی مشکور ہوگی۔

---

(۱) The Greatest Man۔ صفحات ۶۵ قیمت ایک روپیہ

(۲) The Essence of the teachings of the Quran۔ صفحات ۲۱۳ قیمت تین روپے

ان دو کتابوں کے مولف عبدالسلام خاں صاحب، ایڈووکیٹ، ٹھٹہ ہیں۔ اور ناشر مدنی پبلیکیشنز، دارالسلام ٹھٹہ (سندھ)۔ دونوں کتابیں اس ادارہ کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی اور دوسری کڑیاں ہیں۔ اس سلسلہ کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ انگریزی دان طبقہ کے لئے اسلام اور اس کے مشن کے متعلق مکمل معلومات بہم پہنچائی جائیں۔

پہلی کتاب عبدالسلام خاں صاحب نے ۱۹ سال کی عمر میں لکھی اور ۱۹۲۲ء میں ناگپور سے پہلی مرتبہ شائع کی۔ اس میں تمام اعاظم رجال عالم پر پیغمبر عرب محمد صلعم کی برتری ثابت کی گئی ہے اور جا بجا مغربی مستشرقین کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اب اسی کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے لیکن غالباً اس میں کہیں اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

دوسری کتاب میں مولف نے مختلف موضوعات کے تحت بعض متعلقہ آیات قرآنی کو یکجا کیا ہے اور جا بجا مختصر تشریحی حاشیے بھی لکھے ہیں۔ قرآنی مطالب کی تفہیم کا یہ طریقہ اس اعتبار سے قابل ترجیح ہے کہ ہر مسئلہ کے متعلق قرآنی احکام و تعلیمات کے ایک نظر میں سامنے آجانے سے مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن موضوع کے اعتبار سے قرآنی آیات کی ترتیب کوئی آسان کام نہیں۔ اس کیلئے تدبر فی القرآن کی ضرورت ہے۔ پیش نظر کتاب میں اس کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا۔ مولف نے متداول تراجم سے انتخاب کیا ہے اور مروجہ عقائد کو بلا تحقیق قرآنی سند عطا کر دی ہے۔

دونوں کتابوں میں سفید اچھا کاغذ استعمال کیا گیا ہے اور طباعت اچھی ہے۔

دورِ نو | جناب ضامن حسین صاحب گویا جہاں آبادی کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ "دورِ نو" کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں اگست ۱۹۴۴ء سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک کے منظومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اس سے پیشتر ان کی سات تصنیفاتِ نثر اور پانچ تصنیفاتِ نظم شائع ہو چکی ہیں۔ نظم میں "شعر الحکم" کے نام سے ۱۹۳۵ء تک اور "طلوعِ سحر" کے نام سے ۱۹۳۶ء تک کے مجموعہ ہائے کلام بھی شامل ہیں۔ غرضیکہ ان سے نثر و نظم دونوں میں مصنف کی کہنہ مشقی ظاہر ہے۔

مصنف کا موضوع خاص نفسیات اور الٰہیات ہے جس میں مذہب اور تصوف کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ غزل، رباعی، مثنوی، قطعہ ہر صنفِ نظم میں یہی ایک رنگ نمایاں ہے۔ شعر کہنے میں مصنف کے ذہن میں ان مضامین کا اس قدر ہجوم ہو جاتا ہے کہ بمصداق ع

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ

اکثر اوقات الفاظ معانی کا ساتھ نہیں دے سکتے اور اشعار کلام مرموز بن کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً

دیدۂ انتظار ہے سجدہ — کہاں ہوتا اگر ادا ہوتا

چشم و دل کے درمیاں ہے کس لئے شرطِ یقیں — سامنے ان کے خیالِ جلوہ و تنویر کیا

تعمیر کے مقصد سے تعمیر نہیں پہلے — دنیا سے بہت پہلے دنیا میں بشر آیا

ایسے اشعار اس مجموعے میں بہ کثرت ہیں۔ بلکہ عمومی طور پر جناب گویا کا کلام ایسا ہے کہ جب تک پڑھنے والے کے ذہن میں الٰہیاتی مسائل کا پس منظر موجود نہ ہو وہ اشعار کے مفہوم کو نہیں پہنچ سکتا چہ جائیکہ ان سے مستفید یا لطف اندوز ہو۔

مسائل تصوف کے بیان میں مصنف کا نقطۂ نظر بالعموم قرآنی ہے۔ مثلاً تصوف کے مشہور نظریہ "ہمہ اوست" پر متعدد مقامات پر تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ ..

بزمِ انوار کو خورشید نہیں کہتے ہیں — یوں ہمہ اوست کو توحید نہیں کہتے ہیں

ایک اور جگہ لکھا ہے:-

واہمہ ہی یہ "ہمہ" کا ہے "ہمہ اوست" نہیں — "اوست" سے پہلے یہ لوگوں کا "ہمہ" داں ہونا

اس شعر کی تشریح خود اُن کے الفاظ میں یوں ہے:-

اگر ہمہ یعنی وجود ماسوا یا کائنات گرد و پیش کا واہمہ مقدم طور پر دل میں نہ ہوتا تو تنہا اعترافِ اوست ہی حقیقت کی ترجمانی کیلئے کافی ہوتا۔ نظریہ ہمہ اوست یہ صاف بتاتا ہے کہ اوست سے پہلے اعترافِ ہمہ دل میں جاگزیں ہے۔ اس شعر کا روئے سخن ان بزرگ ہستیوں کی طرف ہرگز نہیں ہے جو محویتِ عشق میں ہمہ اوست کہہ اٹھی ہیں۔ صرف وہ لوگ مخاطب ہیں جو بغیر کسی ذوق کے صرف دلائل فکری سے ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ جذبات نظر سے ماورا ہوتے ہیں فکریں نہیں۔ کائنات اثرِ تجلی ہے ذاتِ متجلی نہیں۔ اس لئے خدائی کو خدا نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح سوفسطائیت، لاادریت اور تصوریت ایسے نظریات کی بھی فلسفیانہ انداز میں تردید کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایسے علمی مسائل نظم میں ادا کئے جائیں تو شعریت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانا بعید نہیں ہوتا۔

دورِ حاضر کے اکثر صاحبِ فکر مصنفین کی طرح جناب گویا بھی حضرتِ علامہ اقبالؒ کے خیالات وافکار سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جا بجا لفظی اور معنوی طور پر اس اثر کی جھلک نمایاں ہے۔ اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ کلام میں شگفتگی، جوش اور زندگی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ غزلیات میں ایک یہ شعر بھی موجود ہے :-

آشیاں ہو یا چمن یا شاخِ گُل ہے قفس جو مانعِ پرواز ہو

"دورِ نو" میں مضامین کے تنوع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۲۳۲ صفحے کے مجموعے کو حسب ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے :-

نگاہِ اولیں :- جس میں تمہیدی نظمیں ہیں۔

جمالِ آغاز :- اس میں حمد و نعت کے بعد تخلیقِ عالم پر بحث کی گئی ہے۔

میکدہ :- غزلوں کا مجموعہ ساقی :- مجموعہ نعت و مناقب

رشحات :- مختلف نظموں کا مجموعہ متاعِ کارواں :- ایک مثنوی اور چند مجاہدانہ نظمیں۔

اشاراتِ معنیٰ :- مجموعۂ رباعیات اشراق :- رباعی نما قطعات کا مجموعہ۔

مثنوی ماہ و ہالہ :- جس کے آخر میں کچھ قطعات، غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں۔

کتاب کی لکھائی چھپائی درمیانہ درجے کی ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ :- نظامی بک ایجنسی۔ بدایوں

طلوعِ اسلام

بھارت میں

مندرجہ ذیل مقامات سے آپ حاصل فرمائیں

(۱) سیفی نیوز ایجنسی، کھنڈوہ (۳) حافظ خلیل الرحمٰن صاحب جبل پور

(۲) ماڈل نیوز ایجنسی بارہ دواری جمشید پور (۴) حنیف بکڈپو۔ منارہ مسجد بمبئی ۳

دیگر مقامات پر ایجنٹوں کی فوری ضرورت ہے

بھارت کے ایجنٹ حضرات نیز سالانہ خریدار مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

منیجر ہاشمی نیوز ایجنسی۔ نعل صاحب روڈ۔ ناگپور ۲

نوٹ : کتاب لمیٹڈ کی تمام کتب بھی اسی پتہ سے مل سکیں گی۔

باب المراسلات

۱- عید | ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں عید الفطر کا تہوار کس تقریب کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

طلوع اسلام | اس سوال کے جواب میں ہم اسی عنوان سے تین ریڈیائی تقریریں شائع کر رہے ہیں۔ دو محترم پرویز صاحب اور ایک علامہ اسلم جیراجپوری صاحب کی۔ پرویز صاحب کے الفاظ میں یہ نزول قرآن کی یادگار کا جشن ہے جس کا مطلع رمضان المبارک اور مقطع روز عید ہے۔ وہی عید جس کی خصوصیت اب صرف سیویاں رہ گئی ہے۔

۲- صدقۃ الفطر | ایک صاحب کا استفسار ہے کہ صدقۃ الفطر کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

طلوع اسلام | جیسا کہ طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے صدقات ان ٹیکسوں کا نام ہے جو حکومت اسلامیہ کی طرف سے ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے عائد کئے جاتے ہیں۔ انہی میں صدقہ فطر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں عائد فرمایا (یعنی ہجرت کے فوری بعد۔ روزے سنہ ہجری میں فرض ہوئے تھے) جب ابھی اسلامی حکومت اپنی منظم شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی اور مسلمانوں کو قدم قدم پر ہنگامی ضروریات پیش آ رہی تھیں۔ قرآن میں صدقۂ فطر کا خصوصیت سے ذکر نہیں۔ اسلئے کہ قرآن نے صدقات کا حکم اصولی طور پر دیا ہے، جزئیات متعین کرنے کا کام ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑا گیا ہے۔

اگرچہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، صدقۂ فطر اس زمانے میں عائد کیا گیا جب ابھی مسلمانوں میں اجتماعی نظم حکومت کی شکل میں متعین نہیں ہوا تھا، بایں ہمہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ امور انفرادی نہیں، اجتماعی ہوا کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین ہے اور دین (آئینی نظام زندگی) ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں۔ خود صدقہ فطر کے متعلق تاریخ میں ہے کہ لوگ صدقہ فطر اپنے اپنے طور پر نہیں دیتے تھے بلکہ ان عاملین کے پاس جمع کرتے تھے جو اس مقصد کیلئے مقرر کئے جاتے تھے، اور اس کے بعد وہاں سے اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ طبری میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلعم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس مقصد کے لئے عامل مقرر کیا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ اسلام کی اجتماعی روح کے عین مطابق ہے اسلئے باور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صدقہ فطر کا یہی نظام رائج ہوگا لیکن اب ہماری لامرکزیت کا یہ عالم ہے کہ صدقہ فطر کے وجوب کی تاکید میں ہر محراب و منبر سے آوازیں بلند ہوں گی، لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ سنت رسول اللہ یہ ہے کہ اس صدقہ کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور پھر اس کی تقسیم مرکز ملت کی طرف سے ہو۔ اب سنت رسول اللہ کا صرف اتنا حصہ پیش کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے صدقہ فطر نکال کر اپنے اپنے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا تو روزے معلق رہ جائیں گے، خدا تک نہیں پہنچیں گے۔ گویا صدقہ فطر ملت کے اجتماعی مصالح کے لئے نہیں بلکہ ڈاک کے ٹکٹ ہیں جنہیں

روزوں پر چسپاں کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ روزے مکتوب الیہ (اللہ تعالیٰ) تک پہنچ جائیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ بات کیا تھی اور کیا بن گئی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی!

آج سارے عالم اسلامیہ کو چھوڑیئے۔ ایک پاکستان کو لیجئے۔ یہاں کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے اگر چھ کروڑ بھی ایسے فرض کر لئے جائیں جن کی طرف سے صدقہ فطر دیا جاتا ہے اور فی کس بارہ آنے کے حساب سے اس کا شمار کیا جائے تو عید کے دن دس بجے سے پہلے پہلے ساڑھے چار کروڑ کی رقم صرف اس فنڈ میں جمع ہو سکتی ہے جس سے اور کچھ نہیں تو خانماں برباد پناہ گزینوں کو چھت تو نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے صدقات نکلتے رہیں گے، زکوٰۃ دی جاتی رہے گی۔ قربانیاں ہوتی رہیں گی، لوگ حج بھی کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر بے در بھوکی اور ننگی اسلام کے ماتھے پر کلنگ کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی۔

کتنا بڑا ہے یہ انتقام جو ہزار برس سے اسلام سے لیا جا رہا ہے۔ اور غور کیجئے کہ اس انتقام کیلئے آلۂ کار کن لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔

۳۔ انتظامِ یوسفیؑ ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جب مصر میں قحط پڑا تو حضرت یوسفؑ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ آپ اس مقصد کے لئے کیا کیا تدابیر عمل میں لائے تھے۔ کیا اس کی تفصیل کہیں سے مل سکتی ہے؟

طلوعِ اسلام قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لئے شعبۂ مالیات (منسٹری آف فنانس) میری تحویل میں دیدو۔ اسلئے کہ انی حفیظ علیم، کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روپے کو حفاظت سے کیسے رکھا جا سکتا ہے، اور یہ بھی کہ اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ملک سے غلے کی گرانی کو دور کرنے کیلئے کیا طریق عمل اختیار کیا، اس کی تفصیل تورات میں ملتی ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۴۷ میں اس تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:۔

> اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلے کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر میں لایا اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ تیرے ہوتے ہوئے ہم کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو، اگر نقدی چک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے نہیں دونگا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے لائے۔ اور یوسفؑ نے گھوڑوں، اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گذر گیا وہ دوسرے

سال اُس پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے ہیں کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپایوں کے گلے بھی لئے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو بہت تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انھیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انھیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لئے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے کھیت میں بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یوں ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے۔ اور یوسف نے ساری مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج کے دن تک ہے مقرر کیا کہ فرعون پانچواں حصہ لے۔ مگر فقط کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشتکاروں پر تقسیم کر دیا اور انھیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے حاصل کے آپ مالک تھے۔ صرف پیدائش کا پانچواں حصہ حکومت کو دینا پڑتا تھا۔ تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشتکار کی محنت کے حاصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح سے حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گاؤں کو ذبح کر دیا جو دبلی گاؤں کو کھائے جا رہی تھیں۔

عیش دوام است اینجا

عالم ماست کہ یکرنگ نظام است اینجا
ایں جہانیست کہ آقانہ غلام است اینجا

تشنگی راہ ندیدست بہ میخانۂ ما
تاک ہر خورد و کلاں بادہ بجام است اینجا

رشک صد باغ جناں زندگیٔ گلشنِ ما
برلب غنچہ و گل حرف سلام است اینجا

وادی و کوہ ز ما ذوق تپیدن آموخت
سرو می رقصد و مائل بہ خرام است اینجا

پیشِ ما جادۂ خوش منظر و بے پایاں است
ہمرہِ قافلہ شو عیش دوام است اینجا

جستجوئش چہ کنی در صف ما گام بزن
جلوۂ دوست سر منظر عام است اینجا

تو کہ از کرمک شب تاب کنی کسب ضیا
چشم بکشائے و ببیں ماہ تمام است اینجا

(محمد ایوب)

نفیس ادب

گفت و شنید	۰-۰-۲	الدین القیم	۰-۱۲-۲
افسانۂ زریں	۰-۸-۱	انسانیت موت کے دروازے پر	۰-۰-۳
منٹو کے مضامین	۰-۴-۳	اسلامی تہذیب کیا ہے	۰-۰-۳
دنیا کی مائیں	۰-۰-۱	اقبال کی نئی تشکیل	۰-۸-۶
دہلی چلو	۰-۰-۳	تعمیرِ حیات	۰-۰-۴
انقلاب ۱۸۵۷ء	۰-۸-۲	تاجدِ نگاہ	۰-۸-۳
الطاف کے گیت	۰-۸-۱	تذکرہ اولیاء کرام	۰-۰-۴
پاکستان ہمارا	۰-۴-۱	اسلامی خطبات	۰-۸-۲
گرد و پیش	۰-۰-۳	سیرۃ الصدیق	۰-۰-۲
خودکشی	۰-۰-۳	شخصیت و کردار	۰-۴-۱
دکھ سکھ اور بہاگ	۰-۸-۲	صلاح الدین	۰-۸-۳
بدنصیب ساحرہ	۰-۴-۱	فیصلہ کن جنگیں	۰-۸-۲
آگ اور خون	۰-۰-۴	وادیاں	۰-۸-۵
آثار اقبال	۰-۱۲-۳	اقبال اور قرآن	۰-۰-۵
بچوں کی نفسیات	۰-۱۲-۱	دو آنسو	۰-۰-۳
بیواؤں کا مندر	۰-۴-۱	تاریخ رسالت	۰-۰-۱۵
تاریخ امریکہ	۰-۸-۲	معراج انسانیت	۰-۰-۲۰

ملنے کا پتہ

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ
کراچی (پاکستان)

بھارت میں

ہاشمی نیوز ایجنسی۔ نعل صاحب روڈ
ناگپور ۲ (انڈیا)